جلد 25 شمارہ 3 ماہ مارچ 2023ء شعبان / رمضان 1444ھ

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

اللہ

صداقت

محبت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا تعارف اور اغراض و مقاصد

- سلسلہ عالیہ توحیدیہ ایک روحانی تحریک ہے جس کا مقصد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول، کثرت ذکر مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔
- کشف وکرامات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب وعرفان اور اس کی رضا ولقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا ہے۔
- حضور ﷺ کے اصحاب کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج ہے۔
- موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت مختصر اور سہل العمل اوراد واذکار کی تلقین۔
- غصہ اور نفرت، حسد وبغض، تجسّس وغیبت اور ہوا وہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم ورضا عالمگیر محبّت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا ہے۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا۔ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل وعیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا ہے۔
- اللہ تعالی کی رضا اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح وخدمت کے کام کو آگے بڑھانا اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالی کی محبّت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے ان کے اخلاق کی اصلاح کرنا ہے۔

ماہنامہ

فلاحِ آدمیّت

گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیاد
خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ
بانی سلسلہ

محمد صدیق ڈارؒ
بانی مجلّہ فلاح آدمیت

شیخ سلسلہ و مدیر سے رابطہ

مرکز تعمیر ملت (ڈاکخانہ سیکنڈری بورڈ) وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

info@tauheediyah.com :ای میل Ph: 055-3411030

Website www.tauheediyah.com

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت، جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

قیمت شمارہ -/30 روپے

سالانہ فنڈ -/300 روپے

اس شمارے میں

درس حدیث: ایمان اور استقامت

(حافظ محمد یٰسین)

عن سفیان بن عبداللہؓ قال قُلت یا رسول اللہ قل لی فی الاسلام قول الا اسئل عنہ احدا غیرک قال قل آمنت باللہ ثم استقم ۔ (مسلم)

"حضرت سفیان ابن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اسلام کی تعلیمات کے سلسلہ میں کوئی ایسی بات بتایئے جس کے بارے میں مجھے آپ کے سوا کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اقرار کرو کہ میں اللہ پر ایمان لایا۔ پھر اس اقرار پر ثابت قدم ہو جاؤ۔"

یہ حدیث مبارکہ رسول کریم ﷺ کے کلام کا ایک جامع اور بہترین نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے مختصر سے الفاظ میں ایمان کی حقیقت اور اہمیت کو بڑی خوبصورتی سے بیان فرما دیا ہے گویا آپ نے تھوڑے سے الفاظ میں معانی کا سمندر جمع کر دیا ہے۔ اس حدیث مبارکہ میں سب سے پہلے لفظ قل ہے یہاں قل سے مراد ہے کہ اقرار کرو۔ اقرار اس بات کا کیا جاتا ہے جس کی سچائی پر آدمی کو کامل ایمان اور پورا پورا یقین ہوتا ہے اور اس کی صداقت کو وہ دل و جان سے تسلیم کر چکا ہوتا ہے اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اٰمنت باللہ میں اللہ پر ایمان لایا۔ ایمان یقین کی اس حد کو کہتے ہیں جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے اور جس پر انسان پوری طرح قائم ودائم اور مطمئن ہو۔

اللہ تعالیٰ پر آدمی کا اس طرح کا یقین اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں جو باتیں اللہ کے برگزیدہ بندوں یعنی انبیائے کرام نے بتائی ہیں ان کو

جاننے کے ساتھ ساتھ ان کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے تسلیم کرے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا ثـم استـقـم پھر اس اقرار پر تم ثابت قدم ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

یہ شہادت گاہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

جب کوئی آدمی سچے دل سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو اس پر بڑی بڑی مصیبتیں اور آزمائشیں آتی ہیں ان تمام مصیبتوں اور آزمائشوں کو اللہ کی طرف سے سمجھتے ہوئے ان پر خوش دلی سے صبر کرتے ہوئے اپنے اقرار پر ثابت قدم رہنے کا نام ہی استقامت ہے۔ استقامت کا یہ بھی مطلب ہے کہ انسان کوئی ایسا کام نہ کرے یا اپنی زبان سے کوئی ایسا کلمہ ادا نہ کرے جو اس اقرار کی نفی کا موجب بنتا ہو۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ اپنے دین پر استقامت سے عمل کرنا ایسا ہو گا جیسے ہاتھ میں انگارا پکڑنا"۔ **(ترمذی)**

ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے میری اُمت میں فساد کے زمانے میں میری سنت کو مضبوطی سے تھاما، اس کیلئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق ایمان لانے کے بعد استقامت کے ساتھ اس پر ڈٹے رہنے سے ہی حقیقی کامیابی اور فلاح نصیب ہو سکتی ہے۔ انسان کو ایمان لانے کے بعد اپنے قول و اقرار اور اپنے ارادے پر پوری دلجمعی سے ڈٹ جانے کا نام استقامت ہے۔

کسی خوف، لالچ یا کسی تکلیف کی وجہ سے اپنے ارادے سے ذرا بھی ہٹ جانا استقامت کے خلاف ہے لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ جس طرح عزم و استقلال بہترین

صفات میں سے ہیں اس کے برعکس جہالت اور ہٹ دھرمی نہایت ہی بری اور ناپسندیدہ صفات ہیں جن سے بچنا ہر انسان کے لئے نہایت ہی ضروری ہے۔

بعض لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور جہالت کو استقامت کا درجہ دے دیتے ہیں اور وہ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں حالانکہ صرف اپنی ذاتی رائے یا نقطہ نظر کو ہی حرف آخر خیال کرنا اور سچی بات کو جھٹلانا نہایت ہی ناپسندیدہ عمل ہے۔

جہالت یہ ہے کہ آدمی کسی معاملے کے بارے میں اچھی طرح علم حاصل کئے بغیر ایک رائے قائم کرے اور اس رائے پر جم جائے اسی طرح ضد اسے کہتے ہیں کہ آدمی دل میں تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میری بات غلط ہے لیکن اس کے باوجود وہ لوگوں کو دکھانے کیلئے اس پر اڑ جائے یہ دونوں صورتیں نہایت ہی بری ہیں اور استقلال سے ان کا دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ان باتوں سے یہ ثابت ہوا کہ آدمی علم اور عقل کی روشنی میں اللہ کی ذات وصفات پر اپنے پورے یقین اور اعتماد کا برملا اظہار کرے اور پھر اس پر کتنی ہی تکلیفیں کیوں نہ آئیں وہ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے اپنے اقرار سے ہرگز ہرگز نہ ہٹے۔

جس طرح حضور اکرم ﷺ اور آپ کے جان نثار صحابہ کو اللہ پر یقین کامل تھا ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایمان پر استقامت سے قائم رہو اور یہ یقین رکھو کہ اسلام ہی اللہ کا سچا دین ہے اور یہ آخر کار غالب ہو کر ہی رہے گا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے یہی اہل جنت ہیں کہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہ اس کا بدلہ ہے جو وہ کیا کرتے تھے"۔ (الاحقاف)

حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کا پیغام
پاکستانیوں کے نام

پاکستان ایک نوزائیدہ مُلک ہے اور اس دعوے کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ یہاں صرف قرآن اور سنّت کے مطابق حکومت کی جائے گی۔ دُنیا میں اب تک بیسیوں طرزِ حکومت آزمائے جا چکے ہیں لیکن کوئی طرزِ حکومت بھی انسان کو من حیث الکل مطمئن نہیں کر سکا۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ انسان کو سو فیصدی مطمئن کرنے اور خوش حال و فارغ البال رکھنے والا طرزِ حکومت صرف وہی ہے جس کے اُصول قرآن میں بتائے گئے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے چودہ سو برس تک جن مختلف ممالک پر حکومت کی ان کے عوام ہی کب خوش رہے، علاوہ ازیں تمہارے اسلامی ممالک خود آپس ہی میں ہمیشہ لڑتے اور خونریزیاں کرتے رہے، اِس لیے تمہارا دعویٰ باطل ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ درحقیقت قرآنی اُصولوں کے مطابق حکومت تو صرف رسول پاکؐ کے زمانے سے حضرت عمرؓ یا زیادہ سے زیادہ خلافتِ راشدہ تک ہی رہی ہے اور اس زمانہ میں نہ صرف ممالکِ اسلامی بلکہ اُن ملکوں کے عوام بھی ہر طرح خوش رہے جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی، لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد جتنی بھی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں وہ قرآنی اُصولوں کے مطابق نہ تھیں، اِس لیے ان حکومتوں میں عوام کو وہ امن و سکون میسر نہ ہوا جس کی تلاش میں اہلِ دُنیا ہمیشہ سے سرگرداں و پریشان ہیں

لہٰذا اب ہم پاکستانی محض کتاب وسنت کے مطابق ایک نظامِ حکومت قائم کر کے دُنیا پر ثابت کردیں گے کہ صرف وہی طرزِ حکومت جو قرآن نے بتایا اور رسولِ خدا نے قائم کر کے دکھایا، دُنیا کی فلاح وبہبود کے لیے ممِّمد ہو سکتا ہے۔ یہ بظاہر چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے، لیکن دعویٰ اپنی جگہ پر قائم ہے اور وہ مُلک جو اس دعوے کے تحت بنایا گیا ہے، موجود ہے اس لئے "اے پاکستانی مسلمانو! اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ یہ بات تمام دُنیا کے لیے ایک نیا تجربہ ہے اور تمام اسلامی وغیر اسلامی ممالک کی آنکھیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ سب تمہارے اس دعوے کی صداقت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر تم سچے ثابت ہوئے تو معلوم ہے کیا ہوگا؟ امکان نہیں بلکہ یقینِ کامل ہے دُنیا کے تمام ممالک کی بھاری اکثریت صداقتِ قرآن کی قائل اور تعلیمِ قرآن پر عامل ہو جائے گی۔ لیکن اگر تم ناکامیاب رہے تو ساری دُنیا میں تمہارا، تمہارا نہیں خدا اور رسول کا مذاق اُڑے گا اور اُس کی سزا میں تم اِس دُنیا میں بھی ذلیل ورُسوا ہو گے اور آخرت میں سخت عذاب کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے"۔

قیامِ پاکستان کو کافی عرصہ ہو گیا ہے، اب تک ہم نے کیا کیا ہے، اس پر پورا تبصرہ تو ممکن نہیں اتنا یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں کے باشندوں میں نماز کا چرچا بہت زیادہ ہو گیا ہے، مساجد بھی عام طور پر ہر جگہ نمازیوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اکثر اُمراء اور حُکّام بھی موٹروں میں بیٹھ کر آتے اور اپنے غریب بھائیوں کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جاتے ہیں۔ روزوں کی پابندی اور رمضان کی رونق بھی

پہلے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ زکوۃ دینے والوں اور حج کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے اور حصولِ دولت کے لیے عمل کی قوت میں بھی بے اندازہ ترقی ہوئی ہے اور بے عملی، سُستی اور کاہلی کی تباہ کن عادتیں رفتہ رفتہ کم ہورہی ہیں، لیکن جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں ہمارے پاکستانی بھائیوں نے بالکل ترقی نہیں کی بلکہ الٹا تنزل ہوا ہے، حالانکہ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر غیر مسلم قرآن کریم کی تعلیم اور رسولِ خدا کے اسوۂ حسنہ کو جانچتے، پرکھتے اور اسلام کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ لوگ تمہاری نماز اور روزوں کو ہرگز نہیں دیکھتے، وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کاروبار اور معاشرتی معاملات میں تم ان کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہو یہ لوگ تمہارے اخلاق کے متعلق بہت بُری رائے رکھتے ہیں اور سبب قرآنی تعلیم کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستانی عوام آدابِ مجلس میں بالکل کورے ہیں، بول چال میں ان کی زبان ناملائم، لہجہ سخت اور حرکات وسکنات درشت ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کو راستہ تک چلنے کی تمیز نہیں ہے، راستے میں ہر وقت تھوکتے ہیں، پھلوں کے چھلکے پھینکتے ہیں، چلتے میں ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں، حتیٰ کہ بچوں اور خواتین کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ بسوں اور ٹرینوں میں سوار ہوتے وقت ان کو قطار تک بنانی نہیں آتی۔ چلتے چلتے لڑپڑنا، گالیاں بکنا اور ایک دوسرے سے دست بگریبان ہوجانا ان کی عام عادتیں ہیں جو پاکستان کے ہر شہر میں عام راستوں پر ہر وقت نظر آسکتی ہیں۔ ان لوگوں کو ہم پاکستانیوں کی بددیانتی کا بھی بہت شکوہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستانی نوکر بے انتہا بے ایمان ہوتے ہیں، ہم ان سے سودا منگائیں تو ایک روپیہ کے دو روپیہ وصول

کرتے ہیں اور اگر ہم بازار سے خود جا کرلیں تو پاکستانی دکاندار ایک چیز کی قیمت دس روپے مانگتے ہیں اور آخر میں حجت اور بک بک جھک جھک کے بعد وہی چیز دو روپے میں دے دیتے ہیں۔ اگر یہاں کے سوداگروں سے کوئی بڑا سودا کیا جائے تو بے ایمانی اور بھی بڑی کرتے ہیں۔ ان کو اپنی زبان اور اپنے وعدوں کا بالکل لحاظ نہیں ہوتا۔ نمونہ کچھ دکھاتے ہیں دیتے کچھ اور ہیں۔ حتٰی کہ جو سامان غیر ممالک کو بڑی مقدار میں بھیجا جاتا ہے اس میں بھی یہی بے ایمانی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے باہر کی منڈیوں میں ان کی ساکھ کم ہو رہی ہے، جو غیر ملکی حضرات قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام کی سادگی ،صداقت اور آسانیوں کو دیکھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں وہ جب اسلامی ممالک میں اپنے دینی بھائیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو سخت مایوس ہوتے ہیں۔ ہم نے ایسے کئی حضرات کو بگوشِ خود کہتے سنا ہے کہ ''ہم تو قرآن کی تعلیم کو دیکھ کر ایمان لے آئے مگر جب یہاں آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ مسلمان تو شرافت اور اخلاقِ حسنہ کے نام سے بھی واقف نہیں اور ہم اب یہ غور کر رہے ہیں کہ ہم نے اسلام قبول کر کے غلطی تو نہیں کی''۔

ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم اپنے تمام مسلمان بھائیوں سے عموماً اور پاکستان کے مسلمانوں سے خصوصاً یہ مخلصانہ استدعا کرتے ہیں کہ عبادات کی پابندی کے ساتھ ساتھ آپ اپنے اخلاق کو زیادہ سے زیادہ سنوارنے اور سدھارنے کی کوشش کریں تاکہ اقوامِ عالم اسلام کے متعلق غلط رائے قائم نہ کر سکیں اور آپ کو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب نہ دینا پڑے۔

(اقتباس از تعمیر ملت)

تزکیہ نفس اور نفس مطمئِنہ

(عبدالقیوم ہاشمی)

انسان جسم و روح کا مرکب ہے۔جسم کی اصل مٹی ہے یعنی عالم خلق سے متعلق ہے لہٰذا اسکی تمام ضروریات اسی مٹی سے پوری ہوسکتی ہیں۔روح امر ربی ہے اور اسکا رزق عالم قدس سے متعلق ہے بقول علامہ اقبال قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے۔

عہدالست کے ذریعے تمام ارواح انسانی نے رب تعالیٰ سے ہی حقیقی محبت اور عبودیت کا وعدہ کیا۔جسم میں روح کی عارضی پیوستگی کا مقصد بھی صرف یہ تھا کہ جسمانی اعضاء و جوارح کو استعمال کر کے روح اپنے اندر چھپی ہوئی خوبیوں کو اُجاگر کر کے حق تعالیٰ کی طرف یعنی اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہو جائے۔

والی ربک منتھھا۔(اور تیری منزل مقصود تیرا رب ہے)

لہٰذا انسان کی دائمی اور مجموعی طور سے بڑائی اور عظمت دیگر تمام مخلوقات پہ اُس لمحہ بلند ہوگئی جب نفخ روح کا واقعہ پیش آیا۔

فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوالہ سجدین (الحجر۔29)

(پس جب میں بدن انسانی کو پورا بنادوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو پھر اسکے آگے سجدہ ریز ہو جانا)

نفخ روح کے واقعہ سے لازماً ارواح انسانی کا اتصال رب تعالیٰ سے ہوا یا بالفاظ دیگر محبت الٰہی کا آغاز اسی اتصال سے ارواح انسانی میں نفوذ کر گیا اگر چہ وہ محبت خام حالت میں تھی۔نفخ روح کے مرحلہ کے ساتھ ہی علم الاسماء کی صلاحیت بھی پیدا ہوگئی۔انسانی روح فطرتاً اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب میں سکون محسوس کرتی ہے۔لہٰذا یہ روح

انسانی اپنی مذکورہ بالا خام حالت کی صفات کو لے کر اس دنیا میں آتی ہے اور جسم میں پیوست ہو کر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ دنیاوی زندگی (امتحانی ٹائم) میں تزکیہ سے پختگی پا کر اللہ کی محبت و قرب اور معرفت حاصل کر کے واپس اپنی روحانی دنیا میں چلی جاتی ہے مختصراً یہ کہ عہد الست اور نفخ روح کی بدولت انسان اللہ کی محبت، قرب اور دیدار کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو گیا اور علم الاسماء کی وجہ سے حضرت انسان نے مسجود ملائکہ کا اعزاز حاصل کیا یعنی علم الاسماء کی بدولت اللہ تعالیٰ کی صفات سے آگاہی حاصل ہو گئی لہٰذا صفات الٰہی کے علم کے سبب اشرف المخلوقات، مسجود ملائکہ اور خلافت ارضی کا حقدار ٹھہرا اور تزکیہ کی بدولت عظمت باری تعالیٰ کا یقین بھی میسر آ گیا جسکی وجہ سے حضرت انسان کو بندگی کا درست ادراک حاصل ہو گیا۔

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو وہ ایک ایسے دوراہے پہ کھڑا ہوتا ہے جس میں ایک راستہ شیطان اور دوسرا رحمان کی طرف جاتا ہے یعنی ایک طرف ہلاکت ہی ہلاکت اور دوسری جانب محبت اور رحمت، ایک طرف ناکامی اور مایوسی اور دوسری جانب کامیابی اور خوشی، ایک طرف بے چینی اور کرب اور دوسری جانب اطمینان اور اللہ کا تقرب، ایک طرف ظلمت اور اندھیرا اور دوسری جانب نور علیٰ نور، ایک طرف دھوکہ اور فریب اور دوسری جانب ہدایت لاریب۔

حقیقی علم وہ نہیں جو دنیا ہمیں دے رہی ہے بلکہ علم حقیقی یہ ہے کہ انسان اللہ کے احکامات پہ عمل کر کے آخرت کی حقیقت جانے اور اللہ سے اپنے تعلق کو سمجھ لے اور اُسے مضبوط کر لے۔ انبیاء علیہم السلام نے جو ہمیں علم عطا کیا اِسکی بدولت دوزخ کی آگ اور شیطان کے مکروفریب سے نجات پا کر دائمی سکون والی زندگی میں داخل ہو جائے جو صرف اور صرف اللہ کی پناہ میں آ کر ممکن ہے۔ اِسکے برعکس علم سے دنیا چاہے جتنی بھی ترقی کر لے جہالت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

علمے کہ راہِ بحق نماید جہالت است

(جس علم سے راہِ حق حاصل نہ ہو وہ سراسر جہالت ہے) (شیخ سعدیؒ)

دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے ایک شخص خارجی اثرات اور ہلاکتوں سے تو محفوظ و مامون ہو جاتا ہے مگر اسلامی تعلیمات کے ذریعے اللہ کی سکینت و رحمت و برکات اور قرب و محبت اور حضوری باری تعالیٰ، عرفان انفس و آفاق اور معرفت حق تعالیٰ اور دیدار باری تعالیٰ وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو تزکیہ نفس کی راہ سے گذر کر درجہ احسان کا مرتبہ حاصل کر لے یعنی اُسکا نفس مزکی ہو کر نفس مطمئنہ کی صورت اختیار کر لے۔ یہی لوگ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یا یتھا النفس المطمئنۃO ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃOفادخلی فی عبدیO وادخلی فی جنتیO

ترجمہ! اے نفس مطمئنہ تو اپنے رب کی طرف بڑھتا چلا آ (اِس حالت میں کہ) تمہارا رب تم سے راضی اور تم اپنے رب سے راضی، میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ (الفجر 30-29-28-27)

یوں تو قرآن کریم کی ہر آیت مبارکہ رُشد و ہدایت کا منبع ہے اور ہر آیت مبارکہ انسانی فلاح کی ضامن ہے مگر مذکورہ بالا آیات درحقیقت انسان کے دنیا میں عارضی ٹھہراؤ کے اصل مقصد کو واضح کرتی ہیں ان آیات پر غور فرمائیے کہ ہر وہ شخص جو نفس مطمئنہ کا حامل ہوا ُسے حق تعالیٰ خود خواہش کرتے ہیں کہ وہ اپنے مالک و خالق رب کے قریب سے قریب ہو جائے۔

اِرجعی الی ربک (بڑھتا چلا آ اپنے رب کی طرف) اور یوں بڑھتے بڑھتے بالآخر اللہ کی رضا جیسا سب سے بلند روحانی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ لہٰذا صرف صاحب نفس مطمئنہ

ہی عبد کامل بن کر قرب ومعیت اور رضائے باری تعالیٰ کا مستحق ٹھہرتا ہے۔اِس قرآنی آیت سے واضح ہوا کہ جو شخص نفس مطمئنہ کا حامل ہو وہی حقیقتاً دنیوی حیات کے اصل مقصد کو پورا کرتا ہے۔لہٰذا ہر مسلمان کی کوشش اور ٹارگٹ یہ ہونا چاہیے کہ نفس مطمئنہ ہر حال میں حاصل کرلیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ نفس مطمئنہ ہے کیا؟ کیونکہ جب تک نفس مطمئنہ کی حقیقت معلوم نہ کرلیں حقیقی کامیابی یعنی اللہ کا قرب،معرفت اور رضا کا حصول ناممکن ہے۔لہٰذا قرآن و سنت کی روشنی میں نفس مطمئنہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں نفس کی تین حالتوں کا تذکرہ آیا ہے۔1۔نفس امارہ،2۔نفس لوامہ، 3۔نفس مطمئنہ۔

نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی وضاحت سے پہلے نفس کے متعلق جان لینا ضروری ہے۔نفس خواہشات کا گھر اور مرکز ہے اور دورُخی حیثیت کا حامل ہے یعنی ''شرافت'' اور ''شرارت'' دونوں ہی کا مادہ رکھتا ہے، شیطان اور اُسکے نمائندے دورا ہے پہ کھڑے انسان کے شریر پہلو کو ابھارتے رہتے ہیں۔اگر نفس کا تزکیہ نہ کیا جائے تو نفس انسانی بدی و برائی کا محور و مرکز بن جاتا ہے اور شیطان کا وار بے حد آسان ہو جاتا ہے اِسی کو نفس امارہ کہا جاتا ہے جو نفس مطمئنہ کا بالکل متضاد رُخ (شریر پہلو) پیش کرتا ہے سب سے رذیل اور اسفل یہی نفس امارہ ہے۔

اِنَّ النفس لا مارۃ باالسوءِo

(بے شک نفس امارہ تو انسان کو برائی و بدی پر ہی اُکساتا ہے)

دوسری حالتِ نفس کو نفس لوامہ قرار دیا گیا ہے۔یہ نفس کی وہ حالت ہے جس میں

ضمیر انسانی زندہ ہوتا ہے اور غلط کام کرنے پر ملامت و ندامت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نیکی پر خوشی اور اطمینان کی کیفیات قلب میں پیدا کر دیتا ہے۔ جو شخص نفس لوامہ کی حالت سے ترقی کرتا ہے صرف وہی نفس مطمئنہ کی دولت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ نفس مطمئنہ سے مُراد نفس کی وہ حالت ہے جس میں نفس انسانی پورے اطمینان اور یقین سے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب، مالک اور اِلٰہ مان کر اللہ اور رسولؐ کے احکامات پہ پورے یقین سے عمل کرے اور ہر تکلیف اور ایثار دین کی خاطر بخوشی برداشت کرے۔ ہر لالچ اور حسرت سے دل نجات پا جائے اور قلب میں اللہ کی محبت اور قرب کی لذت مستقلاً محسوس کرے۔

کوئی بھی شخص اُس وقت تک نفس مطمئنہ کی حالت پر فائز نہیں ہو سکتا جب تک وہ تزکیہ نفس کے مرحلہ سے نہ گذرے۔ تزکیہ نفس وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے نفس کی تطہیر ہوتی ہے اور خصائل رذیلہ یعنی خود غرضی، نفس پرستی، غصہ، نفرت، حرص و ہوا، بغض، کینہ، حب جاہ اور جھوٹ سے دل نجات پا کر صبر و برداشت، اخوت، محبت، صداقت، رحم، ایمانداری، سچائی، حلم اور شکر جیسی صفات حمیدہ سے متصف ہوتا ہے۔ جسکا قلب تطہیر نفس کے بعد ان خوبیوں سے مزین ہو گیا سمجھ لیجئے فلاح حقیقی اِسکا مقدر بن گیا۔ یعنی دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سو فیصد کامیابی کی گارنٹی حاصل ہو گئی۔ مطلب یہ کہ اُس نفس انسانی نے مقاصد الٰہی کو پورا کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قد افلح من تزکیO (فلاح پا گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا)

حضور نبی کریمؐ کی بعثت کا حقیقی مقصد بھی نفوس کا تزکیہ کرنا تھا۔ چنانچہ سورہ جمعہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃO

(اللہ وہ ہے جس نے بھیجا اَن پڑھوں کے درمیان رسولؐ اُنہی میں سے جو پڑھتا ہے اُن لوگوں کے سامنے اللہ کی آیات اور پاک کرتا ہے انکو اور سکھاتا ہے اِنکو کتاب وحکمت)

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول کریمؐ کی بعثت کے ان مقاصد کو بیان فرمایا ہے۔

1۔آیات قرآن پڑھ کر سنانا، 2۔تزکیہ نفس کرنا، 3۔احکام الٰہی کی تعلیم دینا، 4۔حکمت یعنی حقیقت ذات وصفات باری تعالیٰ سے آگاہ کرنا۔

تزکیہ نفس کے ذریعے جب نفس کی اصلاح ہونا شروع ہو جاتی ہے تو اسکی بدولت قلب کا تصفیہ بھی ہوتا ہے۔یعنی قلب اللہ کی محبت کو محسوس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔جوں جوں تزکیہ نفس میں بہتری پیدا ہوتی ہے اللہ کی محبت میں بھی اُسی قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں مومنوں کی صفت ''اللہ سے شدید محبت'' ہی کو قرار دیا ہے۔

والذین امنوا اشد حبا للّٰہ

(اور اہل ایمان اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں)

شدید محبت سے مُراد عشق ہے لہٰذا عشق کا تقاضا یہ ہے کہ مومن ہر لحظہ اپنے رب کی یاد اور دھیان میں مشغول رہے۔اب ایسی قلبی کیفیت کا قرآن کریم ہم سے متقاضی ہے۔ حضور نبی کریمؐ کے دور میں صحابہ کرامؓ عشق الٰہی سے بہت جلدی سرشار ہو جاتے تھے کیونکہ آنحضورؐ کی صحبت میں کمال درجہ کا تزکیہ نفس ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے اللہ کی محبت دلوں میں بہت جلد گھر کر لیتی تھی عبادت وریاضت میں نماز، کثرت ذکر، تلاوت قرآن پاک، نوافل اور مجاہدہ میں جہاد، روزہ، زکوٰۃ اور صبر و برداشت صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں شامل تھا جسکی وجہ سے حق تعالیٰ تک رسائی کے مراحل تیزی کے ساتھ طے ہو جاتے تھے۔اور اس طرح صحابہ کرامؓ بہت جلد نفس مطمئنہ کی دولت سے مالا مال ہو جاتے تھے۔جس کی وجہ سے اللہ کی رضا

انہیں حاصل تھی لہٰذا اِسی لئے ساری اُمت صحابہ کے ناموں کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو موسوم کرتی ہے اور یہ اعزاز انہیں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ الغرض آنحضورؐ نے جو معاشرہ قائم فرمایا اُس میں امت کی تربیت تزکیہ نفس کے ذریعے ہوئی اور صحابہ کرامؓ نفس مطمئنہ کے حامل ہوئے۔

دورِ حاضر کے مسلمان لاکھ جتن کرلیں تزکیہ نفوس کے بغیر معاشرہ میں امن و اطمینان کا فقدان ہی رہے گا۔ اگر مسلم معاشرہ قرون اولیٰ کی جھلک اپنے ہاں دیکھنے کا خواہاں ہے تو معاشرے میں مومنین کی تعداد میں اضافہ کئے بغیر چارہ نہیں جو تزکیہ نفس کے ذریعے اللہ کی شدید محبت اپنے دلوں میں پیدا کرنے سے ہی ممکن ہے۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے بانی حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تزکیہ نفس کی خاطر دورِ حاضر کے مسلمانوں کیلئے آسان عملی تربیت کا نصاب تیار کیا ہے جو تزکیہ نفس اور اللہ کی محبت کے حصول میں بے حد مفید ہے اور اسے مصروف زندگی کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہنے کیلئے آسان ذکر یعنی پاس انفاس جو سانسوں کی مطابقت کے ساتھ کیا جاتا ہے اور روزانہ دس پندرہ منٹ کیلئے کلمہ توحید کا ذکر یعنی نفی اثبات کا ذکر ہے۔ مجاہدہ کیلئے غصہ اور نفرت کی نفی اور عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ ذکر و مجاہدہ اور صالح صحبت کے سبب دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور سوئی ہوئی روح بیدار ہو جاتی ہے اور یوں اپنی منزل مقصود کی جانب سفر شروع کر دیتی ہے۔

جوں جوں روح اپنا سفر حق تعالیٰ کی طرف طے کرتی ہے تو وہ جن جن روحانی عوالم سے گذرتی ہے اُن مقامات سے علوم کو اپنے اندر جذب کرتی جاتی ہے۔ اور یوں تخلیقات الٰہی میں پوشیدہ حکمتوں کا ادراک ہونے لگتا ہے اور رب تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے حقائق کھلنا

شروع ہو جاتے ہیں لہٰذا ایسا شخص اللہ کی بندگی کو اختیار کرتے ہوئے رب تعالیٰ کی بزرگی و عظمت کا مکمل طور پہ قائل ہو جاتا ہے اور اس طرح مشاہدہ و یقین کی دولت پا کر عبد کامل بن جاتا ہے اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کے صراطِ مستقیم پر ہے۔اِس طرح عامل حقیقی معنوں میں حق تعالیٰ تک رسائی کے راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے، روح بیدار ہو کر ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت، ھو، عدم، نفس بسیط، عقل بسیط، روح بسیط کے مقامات کو طے کرتی ہوئی اربوں میل کا فاصلہ طے کر کے بالآخر عرش کبریا حتی کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ قدسی میں پہنچ کر رب تعالیٰ کے قرب و دیدار سے محظوظ ہوتی ہے۔اِس طرح وہ براق روح اپنی معراج مکمل کر لیتی ہے اور یوں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ممکن ہوتا ہے۔لہٰذا یہ بات واضح ہوگئی کہ نفس مطمئنہ اور رضائے الٰہی لازم و ملزوم ہیں اور یہ کہ کوئی شخص اللہ کی محبت حاصل کئے بغیر اللہ کی رضا کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔اللہ کی محبت کے حصول کا آسان راستہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی یاد یعنی ذکر اللہ کی کثرت اور اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے۔

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بندو راہ مصطفیٰؐ رو

(اگر تم اِس زمانے میں کوئی مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو ایک ہی صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دل لگاؤ اور رسول کریمؐ کے راستے پر چلو)

تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ

(محمد منظور نعمانی)

1361 ہجری کے اواخر یا 1362 ہجری کے اوائل میں بعض ایسے حالات سے میں دو چار رہا کہ چند دن کسی ایسی جگہ رہنے کی میں نے ضرورت محسوس کی، جہاں دل و دماغ افکار و مکروہات سے محفوظ رہیں اور قلب کو کچھ سکون و اطمینان حاصل ہو۔اس مقصد کے لئے میری نظر انتخاب اس زمانے کے ایک صاحبِ ارشاد بزرگ کی خانقاہ پر پڑی جو آبادی اور آبادیوں کے شور و شغب سے الگ تھلگ جنگل میں واقع ہے۔اور منظر بھی سرسبز و شاداب ہے۔بہر حال میں وہاں پہنچ گیا۔

غالباً پہلا ہی دن تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ محترم بزرگ خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھا، از راہِ شفقت و کرم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھالیا تھا۔ یاد آتا ہے کوئی تیسرا شخص اس وقت وہاں نہیں تھا۔قریب ہی خانقاہ کی سہ دری میں چند ذاکر ''نفی اثبات'' کا اور بعض اُن میں سے ''اسمِ ذات'' کا ذکر کر رہے تھے۔یہ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور مشائخ سلوک کے تجویز کیے ہوئے خاص طریقوں سے قلب پر ضرب لگاتے تھے۔اللہ کے ذکر میں جہر و ضرب کا یہ طریقہ اُس وقت میرے لئے صرف نامانوس ہی نہ تھا بلکہ کسی درجہ میں گویا نا قابل برداشت تھا، چنانچہ مُجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ادب واحترام کے ساتھ عرض کیا:۔

''حضرت ساری عمر دین کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں جو دیکھا ہے اُس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین صرف وہ ہے جو رسول ﷺ اللہ کی طرف سے لائے

اور جس کی تعلیم آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو دی اور پھر صحابہ کرامؓ سے بعد والوں نے سیکھا اور صحیح نقل و روایت کے ذریعے جو اُن سے ہم تک پہنچا۔

اور یہ حضرات ذاکرین جس طرح جہری اور ضربی ذکر کر رہے ہیں جہاں تک اپنا علم ہے نہ تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو یہ تعلیم فرمایا تھا۔ نہ صحابہ کرامؓ نے تابعین سے اس طریقے پر ذکر کرایا اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو ہی یہ طریقہ بتلایا تھا۔ اس لئے ذکر کے اس طریقے کے بارے میں مجھے خلجان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر میرا یہ خلجان کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اسکی تصحیح ہو جائے۔"

اُن بزرگ نے توقع کے خلاف میرے اس سوال کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں فرمایا:۔"مولوی صاحب! یہ بے چارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں' یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے۔ بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لئے میں اُن کو یہی بتلا دیتا ہوں، آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تقریر و تحریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے۔ آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں۔'''

ظاہر ہے یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا۔ لیکن اُن بزرگ نے میری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا اور مجھے کچھ اور عرض کرنے اور اپنے اصل سوال کی طرف مکرر توجہ دلانے کی مہلت دیئے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور اُن کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرما دیا جو میرے لئے بھی دلچسپ تھا۔ اُن کا یہ رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اُٹھانا میں نے بھی مناسب نہ سمجھا اور عشاء کے قریب یہ مجلس ختم ہو گئی۔

اگلے دن مغرب کے بعد پھر یہی ہوا کہ ذاکرین نے اُسی دھن کے ساتھ اپنا اپنا ذکر شروع کیا، مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا لیکن آج بھی اُن

بزرگ نے وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرما کر ہندوستانی مسلمانوں کی غالبًا ماضی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع فرما دیا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

ان بزرگ کے اس رویے سے الحمد اللہ میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا کہ چونکہ میرے سوال کا کوئی جواب ان کے پاس ہے نہیں، اس لیے یہ اس سے پہلو تہی کر رہے ہیں، بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ غالبًا میرے سوال کو ایک اہل اور طالبِ صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا ہے۔ بلکہ ایک مبتلائے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظر انداز فرمایا جا رہا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت اس سوال سے اپنی تشفی (جہاں تک اب یاد ہے) مقصود بھی نہ تھی بلکہ نیت کچھ اور ہی تھی۔

خانقاہ کے جس حُجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نمازِ عشاء وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اُس میں جا کر لیٹ گیا اور تصوف کے اس قسم کے اعمال و اشغال پر بطور خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں خود ہی سائل تھا اور خود ہی مجیب۔ یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحث مباحثہ میں دیر تک نیند نہ آئی۔ میں چاہتا تھا کہ ذہن اس مسئلہ میں بالکل یکسو ہو جائے۔ اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے تو اُس کی تصحیح ہو جائے اور اگر میں ٹھیک طور پر سمجھ رہا ہوں تو پھر اس بارے میں مجھے یقین و اطمینان ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد و انکار کروں اور ان باتوں کے غلط باطل ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کر دوں۔

اسی غور و خوض میں دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرف منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال و اشغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز

کئے ہوئے ہیں اور اپنی قیود و اوضائع کے ساتھ سنت سے ثابت نہیں ہیں)میرا بدعت اور نا درست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانی ،حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان سے بھی ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں، بلکہ بدعات کا حاجی اور بدعات کا رواج دینے والے ماننا پڑے گا۔

کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارے میں تسامح اور تساہل ہی برتا ہو، بلکہ ان کی تعلیم سے اُن کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انہوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر و شغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا ہے، بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے اُن کی کتابوں کو پڑھنے والے اور حالات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلد ہی کر لیا کہ مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا زیادہ ممکن اور زیادہ قرین قیاس ہے، بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ و شاہ اسماعیل شہید جیسے اکابر علم و دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے ۔اور وہ بھی ان حضرات کا عمر بھر اسکے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لئے کر لیا کہ حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور انکے شخصی حالات اور اصلاحی و تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم ،تفقہ فی الدین اور عنداللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ میں

اسرارِ دین کے عارف اور اُمت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قرب خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر اُن میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مُبتلا کرتے رہے۔ بے شک مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحب وحی تو نہیں ہوتا لیکن وہ بدعات کا داعی اور مروج بھی نہیں ہوسکتا۔ خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہو اور وہ اس کا خاص داعی ہو اور اسی کے ذریعہ اصلاح وتجدید کا کام کر رہا ہو۔ اس میں اگر وہ بدعت وغیرہ میں امتیاز نہ کر سکے گا تو یقیناً وہ اصلاح سے زیادہ فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہوگا۔

بہر حال یہ چند خیالی نکتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی الجھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور پا لینے کی کوشش کرنا چاہئے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر میں نے اس غور وفکر کا سلسلہ اُس وقت ختم کر کے سو جانے کا ارادہ کرلیا اور سو گیا۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نماز فجر کے بعد چند میل ٹہلتے ہیں۔ اس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہولیا اور رات کے اپنے ذہنی بحث ومباحثہ اور اُس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا۔

میرے دل و دماغ نے تو یہ مان لیا ہے کہ تصوف کے ان اعمال و اشغال کے بارے میں جواب تک میں نے سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے، لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ گرہ بھی کھل جائے اور جو خلش باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔‘‘

موصوف میری یہ بات سُن کر مسکرائے اور فرمایا: ’’مولوی صاحب! آپ کو یہی تو

شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتلایئے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''بدعت کی تعریف تو علماء کرام نے کئی طرح سے کی ہے لیکن جو زیادہ محقق معلوم ہوتی ہے وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کے لئے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔''

''ہاں ٹھیک ہے، لیکن یہ بتلایئے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اُس طریقے سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو، جس طریقے سے کہ رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی، بلکہ اُس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کے استعمال کو بھی آپ ''دین میں اضافہ'' اور ''بدعت'' کہیں گے؟ (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے یہ فرمایا) مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے۔ اور دین میں اس کا نہایت ہی تاکیدی حکم ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں اس کے لئے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کے لئے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔ نہ مدرسے تھے، نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ صحبت اس مقصد کے لئے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی، تو اللہ تعالیٰ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم و تعلم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا اور اب تک اسی سے قائم ہے، تو کیا تعلیم و تعلم کے طریقے میں اس تبدیلی کو بھی ''دین میں اضافہ'' اور بدعت کہا جائے گا؟''

''نہیں! ''دین میں اضافہ'' جب ہوتا ہے، جبکہ مقصود اور امرِ شرعی بنا کر کیا جائے لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے قدیمی طریقے کے ناکافی ہو جانے کی وجہ

سے کوئی نیا طریقہ جائز طریقہ اختیار کرلیا جائے تو اس کو "دین میں اضافہ" نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا۔"

فرمایا: "بس سلوک کے جن اعمال واشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے، اُن سب کی نوعیت بھی یہی ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تحلیہ کے لئے کرایا جاتا ہے، جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ہر وقت اُس کا اور اُس کی رضا کا دھیان فکر رہنا اور اس کی طرف سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن وحدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دین کے لئے تعلیم وتربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہوتی تھیں اور حضور ﷺ کے فیضان صحبت سے صحابہ کرام کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی۔ لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لیے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی، تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لیے صحبت کے ساتھ "ذکر وفکر کی کثرت" کا اضافہ کیا اور تجربہ سے تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے اُن کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لئے اُن کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے۔ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لئے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے ضرب کا طریقہ نکالا گیا ہے، تو اُن میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر

کیا جاتا ہے اوراسی لئے مقصد حاصل ہوجانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ طریق اپنے اپنے زمانے کے حالات اوراپنے اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں ردو بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں اوراب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لیے ان کے خاص حالات اوران کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال واشغال تجویز کردیتا ہے اوربعض ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنہیں اس طرح کا کوئی ذکرشغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اوراللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرمادیتا ہےاس سے ہرشخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کوصرف علاج اور تدبیر کے طور پرضرورتاً کیا کرایا جاتا ہے۔"

ان بزرگ کی اس تقریراورتوضیح سے میرا ذہنی خلجان تو دورہوگیا لیکن ایک نئی پیاس یہ پیدا ہوگئی کہ یہ جوکچھ فرمایا گیا ہے اس کوخود آزما کے دیکھا جائے اوراپنے ذاتی تجربے سے قلبی اطمینان اورمزید یقین حاصل کیا جائے ،لیکن میرے حالات اورمشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربے کے لئے میں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں۔اس لیے میں نے بےتکلف اورصفائی سے عرض کیا:۔"اگر یہ ذکرشغل ان مقاصد کے لیے کیا جاتا ہےاور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں تو پھر تو میں بھی اس کا محتاج ہوں،لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق قائم کررکھا ہے۔اُن کو بھی میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

فرمایا:۔ مولوی صاحب!تصوف دین کے کام چھڑانے کے لیےنہیں ہے بلکہ اس سےتو دین کے کاموں میں قوت آتی ہےاور جان پڑتی ہے۔لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ کی مشیت ہے، جن کواللہ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ اب ادھرتوجہ ہی نہیں کرتے،حالانکہ اگر

تھوڑی سی توجہ ادھر دے دیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔حضرت خواجہ صاحبؒ نے باوا صاحبؒ نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ ،حضرت شاہ صاحب نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا (جن کا سوواں اور ہزارواں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر سک رہی ہیں اُس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اُس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستہ سے پیدا کی گئی تھی ۔لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بے چارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں ۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں ۔ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔''

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:۔''خدا معلوم لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں،تصوف تو بس صرف اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہوسکتا ہے ،وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے،اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مبارک ہے،وہ اسی راستے سے حاصل کر لے اور ہم کو بھی بتلا دے،ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سینکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے جن میں سینکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہدین بھی تھے اور صاحب الہام بھی تھے۔''

میں نے عرض کیا:''جو شخص پہلے سے کسی دینی کام میں لگا ہوا ہو اور وہ یہ محسوس کرتا ہو کہ اُسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں ہے تو کیا وہ کسی مدت تک اُس کام کو چھوڑ کے پہلے اس کی تحصیل کرے،یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اُس کو بھی کرتا رہے اور اُس کے ساتھ اس کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے؟

فرمایا:۔''ہاں !ہوسکتا ہے،البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں کچھ مدت کے لئے یکسوئی کے ساتھ اسی طرف مشغول ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

میں نے عرض کیا:۔

''کیا اس کے لیے بیعت ہونا بھی ضروری ہے؟''فرمایا:۔''نہیں بالکل نہیں !ہاں طلب اوراعتماد کے ساتھ محبت اورصحبت ضروری ہے، بیعت تو صرف تعلق اوراعتماد کے اظہار کے لئے ہے،ورنہ اصل مقصد میں بیعت کو کوئی خاص دخل نہیں ہے۔''

میں نے عرض کیا:۔

''پھر مجھ کو بھی کچھ فرمادیں۔''فرمایا:''مولوی صاحب !حدیث میں ہے(جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اُس کو پوری دیانتداری سے مشورہ دینا چاہئے) میں آپ کے لیے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ اس مقصد کے لئے فلاں صاحب یا فلاح صاحب کی طرف رجوع کریں، ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے اور آپ جیسے علم والوں کے لئے میں اُن ہی حضرات کو اہل سمجھتا ہوں۔''

میں نے عرض کیا''ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے بھی کچھ دل میں تھی اور اب حضرت کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہوگئی ،لیکن چونکہ مجھ میں یہ طلب پیدا نہیں ہوئی ہے اس لئے میں تو اس راستے میں حضرت ہی سے راہنمائی حاصل کرنا اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔''موصوف نے اپنی محبت وشفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک یا دو دفعہ پھر انہی دونوں بزرگوں کا حوالہ دیا،لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمالیا اور میری مصروفیتوں کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پروگرام تجویز فرمادیا۔اور میں نے کرنا شروع کردیا۔

اس کے بعد میں غالباً چار پانچ دن وہاں اور مقیم رہا۔ جب اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو خاص اہتمام سے فرمایا:۔

''حضرت دہلوی (یعنی حضرت مولانا محمد الیاسؒ) کی خدمت میں آپ ضرور جایا کریں اور کچھ قیام کیا کریں۔''

اس موقع پر مولانا موصوف کے متعلق بہت بلند چند کلمات بھی ارشاد فرمائے اور یہ حقیقت ہے کہ ان بلند کلمات ہی نے مجھے اس مشورے کی تعمیل پر آمادہ کیا اور جیسا کہ مولانا مرحومؒ کے ملفوظات کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، اس کے بعد ہی میں نے مولانا موصوف کی شخصیت کو کچھ جانا اور کچھ عرصے کے بعد میں یہ بھی سمجھ سکا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتنے اہتمام سے مجھے کیوں مشورہ دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ خانقاہیت اور خانقاہی مشاغل اور اہلِ خانقاہ سے مجھے جو بُعد تھا اس میں اچھا خاصا دخل میرے اس احساس کو بھی تھا کہ ان حلقوں میں دین کا فکر اور اُس کی خدمت کا جوش کم پایا تھا، حالانکہ میں اُسکو رسول اللہ ﷺ کی خاص میراث سمجھتا ہوں، میرا خیال ہے کہ ان بزرگ نے میرے اس احساس کو سمجھ کر اس کی اصلاح وتعدیل کے لئے ہی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضری اور قیام کی مجھے اتنے اہتمام سے تاکید فرمائی گئی، گویا مجھے ایک عشق باز اور صاحبِ اخلاص بندے کے دین کے درد اور اس راہ میں اس کی تڑپ اور بے کلی کا مشاہدہ کرانا تھا اور دکھانا تھا کہ دین کی خدمت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

اے مرغِ سحر عشق زپروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد

آٹھ نو برس پہلے کا واقعہ ہے، حافظہ نے اب تک جتنا کچھ محفوظ رکھا لکھ دیا ہے، اپنی

اور اُن بزرگ کی گفتگو کا جو حصہ نقل کیا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اصلی الفاظ میں نقل کرنا ممکن نہ تھا۔اس لئے ان سب کو روایت بالمعنی ہی میں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس سلسلہ کی بعض باتیں رہ گئی ہوں اور بعض ایسی باتیں یہاں لکھی گئی ہوں جو اس موضوع پر بعد میں کسی اور صحبت میں اُن بزرگ سے سنی گئی ہوں۔بہر حال جو توضیحات وتشریحات اُن بزرگ کی طرف منسوب کر کے یہاں لکھی گئی ہیں اس کا اطمینان ہے کہ وہ سب اُنہی کی ہیں۔

تصوف کے اعمال واشغال کے متعلق جس ذاتی تجربہ کا ارادہ کیا گیا تھا، افسوس ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لا اُبالی پن کی وجہ سے اور کچھ اپنے دیگر مشاغل کی کثرت اور خاص نوعیت کے سبب سے کماحقہ وہ تجربہ تو نہیں کیا جا سکا، تاہم جوٹوٹا پھوٹا اور برائے نام سا تعلق اس سلسلے سے اور اُس کے اشغال سے ان چند سالوں میں رہا اور اس کی وجہ اس راہ کے بعض اکابر سے جو قرب حاصل رہا اور اُن کے احوال اور ماحول کو قریب سے مطالعہ کرنے کا جو موقع ملا اُس سے چند یقین حاصل ہوئے، جن میں سے بعض تصوف کے مخالفین اور منکرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں اور بعض خود اہلِ تصوف کی خدمت میں پیش کرنے ضروری ہیں۔

خدا لگتی بات یہ ہے کہ غریب ''تصوف'' اپنے منکروں اور مخالفوں کا تو مظلوم ہے ہی ،لیکن جو اس کے عامل اور علمبردار ہیں، کچھ ان کی بعض چیزیں بھی اس مظلومیت کا باعث بن رہی ہیں۔

رمضان المبارک نیکیوں کا موسمِ بہار (از خطباتِ حرم)

(امام کعبہ الشیخ عبدالرحمٰن السدیس ترجمہ: محمد عبدالہادی العمری)

"ہر قسم کی حمد اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ہم اسی سے مدد طلب کرتے ہیں، اسی سے ہدایت چاہتے ہیں،اسی سے مغفرت طلب کرتے ہیں اسی کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، اسی پر توکل کرتے ہیں اور اسی کی ثنا بیان کرتے ہیں اور اپنے نفس کی شرارتوں اور بداعمالیوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔جسے اللہ نے ہدایت عطا فرمائی اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔اللہ نے اپنے بندوں پر رحمت اور مغفرت کے دروازے کھول کر بہت بڑا کرم فرمایا اور ان کیلئے نیکی اور حسن سلوک میں اضافے کی گھڑیاں مقرر کیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں جو نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے والوں میں سب سے بہترین اور تہجد ادا کرنے اور قیام اللیل کا اہتمام کرنے والوں میں سب سے افضل ترین ہیں۔اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں آپ پر، آپ کی آل اور اصحاب پر اور ان تمام لوگوں پر جو ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔"

برادرانِ اسلام! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔اللہ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اضافی عبادت اور اجر و ثواب کمانے کا موسم بنایا ہے ایسا موسم عطا کیا ہے کہ اس سے ایمان کی بہار آتی ہے، عمل کی کھیتی لہلہاتی ہے، ہر طرف اجر و ثواب کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور بجھے ہوئے دلوں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے، اس وقت جبکہ ہم تقویٰ اور پرہیزگاری کے موسم بہار "**رمضان**" سے گزر رہے ہیں جس میں

روحانیت اور نورانیت کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا نہ اس کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ اس مبارک مہینے میں مسلمان قرآن مجید کے سایۂ عاطفت میں زندگی گزارتے ہیں، اس میں وہ اپنے پروردگار سے رحمت، مغفرت اور رضوان کے طلب گار ہوتے ہیں اور اللہ کی بارگاہِ عالی سے جنت کی تمنا کرتے ہیں۔ بلاشک وشبہ یہ مہینہ نیکی وتقویٰ، اصلاح اور ہدایت کا مہینہ ہے جس میں اہل دل ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے ربّ کی کرم فرمائیوں سے اپنی جھولیاں بھر سکیں۔

برادرانِ اسلام! اس اہم مہینے کے کچھ احکام ومسائل بھی ہیں۔ مسلمانوں کو ان کا علم ہونا چاہیے تاکہ وہ اس موسم بہار کی کماحقہ قدر کر سکیں، روزوں کی حکمت کو سمجھ سکیں کیونکہ فرضیتِ صوم کا یہ مطلب نہیں کہ صرف دن کے اوقات میں ہم کھانے پینے سے رُک جائیں اور بس! بلکہ اس کی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہے تاکہ ہم صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ روحانی اعتبار سے بھی روزے دار بن سکیں۔

برادرانِ اسلام! اُمتِ مسلمہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ احتساب، تدبر اور تفکر کی اہمیت کو سمجھے، خصوصاً اس مہینے میں جبکہ ہر طرف نیکی اور خیر کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ مہینہ ہمیں بردباری اور صبر کی غیر معمولی تعلیم دیتا ہے۔ اس میں مومن کا ایمان زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہ خود کو زمانے کے فتنوں اور زندگی کی آلائشوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مہینے میں بجا طور پر انسان کی روحانی بیماریوں کا تیر بہدف علاج اور رِستے زخموں کا مرہم موجود ہے۔ اس ماہ مبارک کی بدولت بے لگام نفس کو لگام دی جا سکتی ہے اور نفس کو طرح طرح کی کدورتوں، بغض اور حسد سے پاک کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک دوسرے کی ہمدردی اور غم خواری کی وہ کیفیت ہے جو کسی اور موقع پر ممکن نہیں۔ یقیناً یہ مہینہ صالحین کیلئے اجر وثواب

سے اپنے دامن بھرنے کا مہینہ ہے۔اور گناہ گاروں کیلئے اپنے ربّ کی عفوودرگزر طلب کرنے کا بھی یہی خصوصی مہینہ ہے۔یہی وہ مہینہ ہے جس میں مسلمان اپنے درخشاں ماضی کی تابندہ یادوں کا تذکرہ کر کے آسودہ ہوتا ہے اور بجاطور پر اسے غور کرنا ہوتا ہے کہ کیا وہ اس مبارک مہینے کی مبارک ساعتوں سے فائدہ اٹھارہا ہے یا خوابِ غفلت کا شکار ہے؟ ہر مسلمان کو اس ماہِ مقدس میں جائزہ لینا چاہیے کہ کیا میری زندگی کی کیفیت اس ماہ میں سال کے دیگر مہینوں سے مختلف ہے؟ کیا اس میں کوئی اچھی بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے؟

مسلمانوں میں کچھ چیزیں عام طور پر رواج پا گئیں ہیں،ان کی تشخیص اور علاج ازحد ضروری ہے،جیسے دینی مسائل میں کم فہمی،دین کے اسرار و رموز سے ناواقفیت۔ہمارے روزوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ہمیں ماہِ صیام میں اپنے صوم کو شریعت کی میزان میں تولنا ہوگا اور سنت کی روشنی میں جائزہ لینا ہوگا کہ کیا ہمارے روزے وہی ہیں جس کا حکم دیا گیا یا یہ صرف ایک رواجی روزے ہیں کہ اوروں نے روزہ رکھا تو ہم نے بھی رکھ لیا۔ہم سوچ بچار کی ان باتوں پر اگر ہم اس مبارک مہینے میں غور نہیں کریں گے تو پھر ہمیں غور کرنے کی فرصت کب ہوگی؟

اگر ہمارے ذمہ دار اس بابرکت مہینے میں کتاب عزیز سے رشتہ نہیں جوڑیں گے تو پھر وہ گھڑی کب آئے گی جب وہ کتاب اللہ کی بالادستی عملاً تسلیم کریں گے اور اس کے احکام اپنی رعایا پر نافذ کریں گے؟ اگر ہمارے علمائے کرام اور دانشورانِ ملت کو کتاب اللہ کی تعلیم اور پرچار کا احساس اب پیدا نہ ہوا تو پھر یہ احساس کب پیدا ہوگا؟ ہماری صفوں میں اگر اب بھی اتحاد پیدا نہ ہو سکا تو پھر وہ لمحات کب میسر آئیں گے جب ہم اپنی شیرازہ بندی کر سکیں گے؟ حالانکہ اس مہینے کا آغاز ہم نے اکٹھے کیا۔اس میں دن کے روزے اور رات کی عبادت ہم سب مل کر کرتے ہیں تو پھر ہم میں یہ دراڑیں کیوں؟ اور یہ دوریاں کب تک اور کس لیے؟

اگر ہم ہوائے نفس کی برائیوں سے حسد، بغض اور عداوت سے اب نہیں بچے تو پھر ان بیماریوں سے کب چھٹکارا ملے گا؟ اگر ہماری زبانیں جھوٹ، غیبت، بہتان اور گالی گلوچ سے محفوظ نہیں تو پھر ہم ان برائیوں سے نجات کیلئے کس وقت کا انتظار کر رہے ہیں؟ کیا کوئی اس سے بہتر مہینہ ہے جس میں ہم خود کو اللہ کے احکام اور اس کے رسول ﷺ کی سنتوں کا خوگر بنائیں؟ اگر ہمارے نوجوان اس مہینے سے فائدہ نہ اٹھائیں اور ہماری خواتین احکام اور شعائرِ اسلامی کی پاسداری کی فکر نہ کریں تو پھر ان پر عمل کب ہوگا؟ اگر اُمت کا خوشحال طبقہ محتاجوں کی دستگیری کی اب کوشش نہ کرے تو پھر انکی دولت ضرورت مندوں کے کب کام آئے گی؟

اس ماہِ مبارک کی عبادت کا جذبہ وقتی اور موسمی نہیں بلکہ دائمی ہونا چاہیے تاکہ یہ مہینہ ہمارے ایمان کی مضبوطی، اعمال کی تقویت اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ بن جائے۔ یقیناً بشارت ہے ان مومنوں کیلئے جو گناہوں کو چھوڑیں تو دوبارہ ان کا رخ نہ کریں۔ یقیناً خوشخبری ہے ان روزہ داروں کیلئے جو روزوں کو بوجھ یا رسمی خانہ پُری کیلئے نہیں بلکہ عبادت اور اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ بنائیں۔ ہمیں اپنے نفس کے دھوکے سے بچنا چاہیے کہ ہم نے خوب عبادت کی اور بڑی ریاضت کی، اس لیے اللہ کی رضا مل کر رہے گی، سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کے مقابلے میں ہماری عبادت کی حیثیت ہی کیا ہے؟ کہیں نفس کا دھوکا خسارے کا موجب نہ بن جائے۔ عبادت گزار مومن بندے اس مہینے کی تیزی سے واقف ہیں کہ یہ بادِ بہاری کے جھونکوں کی طرح آتا اور گزر جاتا ہے لیکن غافل لوگ اس مہینے میں بھی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی راتیں فضولیات اور لہو ولعب میں بسر ہوتی ہیں، دن سستی اور آرام کرنے میں گزرتے ہیں اور جب فرصت ملے تو زبانیں بے ہودہ گوئی اور آنکھیں ممنوعہ چیزوں کے نظارے میں محو رہتی ہیں۔ ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار ہو جانا چاہیے

ہمیں رمضان کے قیمتی لمحات سے فائدہ اٹھانے کے لیے کمر بستہ ہو جانا چاہیے، یہ غفلت اور سستی کب تک؟ کیا ہم نہیں جانتے کہ پچھلے سال ہم میں کتنے ہی ایسے بھائی تھے جو آج ہم میں موجود نہیں، ہم ہی نے انہیں منوں مٹی کے نیچے دبایا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ گزشتہ رمضان ان کی زندگی کا آخری رمضان ثابت ہوگا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آئندہ رمضان ہمیں ملے گا یا نہیں ہوسکتا ہے کہ موجودہ رمضان ہی ہمارے لیے آخری رمضان ثابت ہو بلکہ کیا معلوم کہ موت کی گھڑی اس رمضان کے مکمل ہونے سے پہلے ہمیں دبوچ لے اور پھر ہمیں بھی وہاں جانا پڑ جائے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

رمضان کے باقی دنوں کے گزرنے سے پہلے ہمیں بیدار ہو جانا چاہیے کیونکہ اس کے گزرتے دیر نہیں لگتی۔ ابھی ہم اس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے کہ ماہِ رمضان سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہیں؟ کیا ہم اپنی زندگی کا گناہوں سے آلودہ صفحہ پلٹ کر عبادت سے آراستہ نیا صفحہ کھولنا چاہتے ہیں؟ پھر آخری عشرہ جس میں لیلۃ القدر بھی ہے۔ کیا ہم عبادت کے لیے کمر بستہ ہونگے؟ کیا ہم بارگاہِ الٰہی سے مغفرت کے طلبگار رہوں گے؟ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم گناہوں سے آلودہ زندگی کو نیکیوں سے بدل ڈالیں؟ اگر ابھی نہیں آیا تو پھر وہ کب اور کون سی گھڑی ہوگی جس کا ہمیں انتظار ہے؟ ہمیں حصولِ جنت کی کوشش میں پوری توجہ سے لگ جانا چاہیے اور جہنم سے نجات کی فکر کرنی چاہیے۔ اے! خیر کے متلاشی! آگے بڑھ۔ اور اے! شر پسند! پیچھے ہٹ جا۔

عزیز بھائیو! آخری عشرے سے ہماری درخشاں تاریخ کی عظیم یادیں وابستہ ہیں اسی عشرے میں وہ عجیب و عظیم واقعہ پیش آیا جس نے دھارا بدل ڈالا، جس نے لوگوں کو ایک نیا ولولہ عطا کیا اس اُمت کی سرفرازی اور سر بلندی دین سے وابستگی میں ہے۔ یہ غزوۂ بدر کا

واقعہ ہے۔اِس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایسی سرخروئی عطا فرمائی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس معرکۂ حق و باطل میں بہت کم افرادی قوت والے اصحاب ایمان وعمل نے بے حد قلیل جنگی ساز و سامان کے باوجود کفر وشرک کے ان سرغنوں کو شکست دے دی جو تعداد میں کہیں زیادہ اور بھاری اسلحے سے لیس تھے۔

''اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔''

اللہ کا وعدہ ہے کہ ''اور مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم ہے۔''

اس وقت اُمتِ مسلمہ جن پُر آشوب حالات سے گزر رہی ہے۔ اِس تناظر میں اُسے غزوۂ بدر سے ایمان کی محکمی، عمل کی درخشندگی اور ہمت کی بالیدگی کا سبق سیکھنا چاہیے۔ جو لوگ اپنے ماضی سے سبق نہیں لیتے ان کے مستقبل کی کامیابی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہمارا ایک نہایت عظیم الشان درخشاں ماضی ہے۔اس سے ہم اپنے حال اور مستقبل کی کامیاب منصوبہ بندی کر سکتے ہیں، اس واقعہ میں ایک سبق آموز پہلو یہ بھی ہے کہ یہ مہینہ سستی اور غفلت کا نہیں بلکہ جدوجہد، جہاد اور اجتہاد کا مہینہ ہے۔اس میں مسلمانوں کو صرف ایک نہیں بلکہ مختلف شاندار کامیابیاں ملیں۔ اس واقعے میں یہ سبق بھی چمک رہا ہے کہ انسان کٹھن حالات سے پریشان نہ ہو اگر یقینِ محکم ہو تو حالات کا رخ بدلا جا سکتا ہے، شب تاریک سے صبح درخشاں نمودار ہو کر رہتی ہے، حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہماری یہی امیدیں مسجد اقصیٰ اور فلسطینی بھائیوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔لیکن یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنے فکر و عمل میں جلوہ گر کریں۔ ہر قسم کی غیر اسلامی حرکت سے پرہیز کریں کیونکہ اللہ کی مدد دین سے وابستگی اور اس پر عمل پیرا ہونے سے مشروط ہے۔

کیا ہم اس رمضان میں اپنی تاریخ کو دہرا سکیں گے؟ کیا ہم اپنی عبادت سے تقرب الٰہی کی راہیں تلاش کر سکیں گے؟ کیا ہم اس ماہ کو اجر و ثواب اور نیکیوں کے حصول کا ذریعہ بنا پائیں گے؟ کیا ہم میں اسلامی اخوت و غمگساری کے مطلوبہ جذبات پیدا ہو سکیں گے؟ اللہ ہمیں اپنی نصرت اور کامیابی سے سرفراز فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کی برکت سے مالامال کرے اور نبی کریم ﷺ کے طریقے کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ ہماری مغفرت فرمائے، آمین۔

"ہر قسم کی حمد اللہ ہی کیلئے ہے جس نے رمضان کے ان ایام کو گناہوں کی ڈھال، تقوے میں اضافے اور جنت میں داخلے کا سبب بنایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ عبادت کے لائق سوائے اللہ کے کوئی نہیں جس نے ہمارے لیے روزے مقرر فرما کر ہم سب پر احسان کیا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں جو سب سے بہترین امت اور سب سے متوازن طریقے کے داعی ہیں۔ اللہ کی رحمتیں اور سلامتی ہو آپ ﷺ پر، آپ کی آل پر اور اصحاب پر۔"

عزیز بھائیو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اس کے احکام کی قدر کرو اور اس کے شعائر کی تعظیم کرو۔ اس مبارک مہینے کی ایسی قدر کرو جس طرح اس کا حق ہے۔ اس کے شب و روز سے بھرپور فائدہ اٹھاؤ۔ اپنے روزوں کو ہر غلط چیز سے پاک رکھو۔ خبردار رہو کہ کہیں ہمارے روزے صرف بھوک پیاس کی حیثیت اختیار نہ کر جائیں اور ہماری راتیں صرف شب بیداری نہ بن جائیں۔ ہمارے سامنے اپنے محبوب نبی ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہونا چاہیے۔ آپ جود و سخا کے پیکر تھے لیکن رمضان میں خاص طور پر خیر اور تقوے کے کاموں کی انجام دہی میں آپ ﷺ کا ہاتھ اتنا تیز تھا جیسے بادبہاری چل رہی ہے، حالانکہ اللہ نے آپ کو وہ شان عطا فرمائی کہ آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کیے جا چکے تھے، اس کے باوجود اگر آپ کی

یہ کیفیت تھی تو پھر غور کرنا چاہیے کہ ہم جیسے گناہ گاروں اور ناتوانوں کا کیا حال ہونا چاہیے؟

برادرانِ اسلام! اپنی نماز، روزہ، ذکر و اذکار اور تلاوت و دُعا کے ساتھ ساتھ ادائے زکوٰۃ میں غفلت نہ کیجیے۔ یہ فریضۂ الٰہی ہے، یہ اسلام کا تیسرا رکن ہے، اس لئے زکوٰۃ برضا و رغبت ادا کرنی چاہیے تاکہ اس مبارک مہینے میں غریبوں، مسکینوں، ضرورت مندوں اور مجاہدین کی قدر ہو سکے۔ جب آپ اپنے لیے دعا کریں تو اپنے بھائیوں کو نہ بھولیں جو مختلف پریشانیوں سے دوچار ہیں۔ دعا ان کی راحت کا ذریعہ اور تقویت کا سبب ہے، فرمان الٰہی ہے:

"اور (اے نبی!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب بھی وہ مجھ سے دعا کرے۔"

لوگو! اپنی اصلاح کرو۔ توبہ کی فکر کرو، راہِ راست پر قائم رہو۔ ہر مسئلے میں اللہ کی طرف رجوع کرو۔ شاید تمہاری نجات ہو جائے اور اس مبارک مہینے کی برکت سے تمہیں عذاب سے چھٹکارا مل جائے۔ درود و سلام پڑھیے! نبی رحمت اور ہادی اُمت اشرف الانبیاء والمرسلین پر جس کا رب العالمین نے ہمیں حکم دیا ہے۔

جوانی کی بارہ سیڑھیاں

(ایم انور بن اختر)

یہ ایک انگریزی کتاب ہے جس کے مصنف ہیں مسٹر ولفورویل اور کتاب کا نام (Pro Long Your Youth) یعنی اپنا عرصہ حیات لمبا کرو۔اس شخص نے زندگی کے مسائل کے ہر ایک پہلو پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس نے اپنی کتاب جو جوانی کی طوالت کے متعلق لکھی ہے،جس کے اختتام پر جو بارہ اصول لکھے ہیں میں ان کو جوانی کی بارہ سیڑھیوں کا نام دیتا ہے۔ان بارہ اصولوں پر کاربند ہو کر انسان اپنی عمر میں اضافہ کر سکتا ہے۔وہ بارہ سیڑھیاں درج ذیل ہیں۔

ا۔زندگی کے فلسفے کو سمجھنا: انسان خیالات کا پتلا ہے۔انسان کے خیالات ہی انسان کو آسمان پر پہنچا سکتے ہیں اور یہ خیالات ہی تحت الثریٰ میں لے جا سکتے ہیں۔اس کے خیالات کی پاکیزگی اور پلیدی لازمی ہے جو آدمی جیسا سوچے گا ویسا بن جائے گا۔ہر حال میں خوش رہنا چاہئے۔یہی زندگی کا حقیقی فلسفہ ہے اس لیے مایوسی اور فکر کو پاس نہ آنے دے۔

۲۔تنظیم: اپنی ذات کی اپنے کاروبار،اپنے کھانے پینے کی،سونے جاگنے کی،اٹھنے بیٹھنے کی،کھیل کود کی غرض یہ ہے کہ ہر ایک بات میں تنظیم سے کام لو۔جس طرح حدود کے اندر بہتا دریا بے شمار بندگان خدا کو فائدہ پہنچاتا ہے اور حدود توڑ کر ہزاروں کی تباہی کر سکتا ہے اسی طرح تنظیم کی زندگی لطف و سرور کا سرچشمہ ہوتی ہے اور تنظیم سے باہر بے قاعدہ زندگی آفتوں اور مصیبتوں کی آماج گاہ بنتی ہے۔

۳۔ دلچسپ پیشہ یا کاروبار: اگر انسان کا دھندہ روزگار ایسا ہو جس میں دل بھی لگا رہے اور روزی کا بھی سامان انسان کیلئے کافی مہیا کرے تو زندگی کو بڑھانے میں بہت مدد دیتا ہے۔ کام کاج ایسا ہونا چاہئے جس میں محنت بھی کرنی پڑے اور آرام بھی ملے، پیسے بھی اچھے ہوں اور دل کو اکتانے والا بھی نہ ہو۔

۴۔ بدن کی اندرونی صفائی: جسم کے اندر فاسد مادہ نہ رہنے دیا جائے۔ ضرورت پڑے تو ایک دو دن کے فاقہ سے یا ایذا کر کے یا بھاپ کا غسل کر کے فاسد مادہ خارج کر دینا چاہئے۔

۵۔ زندگی بخش خوراک: جو چیزیں جتنی زیادہ مرتبہ آگ پر چڑھائی جائیں گی اتنی ہی زیادہ مردہ خوراک بن جائیں گی جو مفید نہیں ہوتیں۔ اس لئے اچھی خوراکوں میں تازہ پکے پھل، خشک گری اور دوسرے میوے سبزیات، تازہ، مکھن، کچا دودھ، شہد، پنیر تازہ انڈے شامل ہیں۔ سفید چینی نشاستہ اور گوشت منع ہے۔

۶۔ ٹھیک سانس لینا: تازہ کھلی ہوا میں زیادہ سے زیادہ دیر تک رہنا اور ناک کے ذریعے پورا سانس لینا جس سے پھیپھڑوں کے ہر حصے میں تازہ ہوا بھری جائے اور غلیظ ہوا باہر نکل جائے دن میں کئی بار خاص طور پر سیدھے کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لینا۔

۷۔ زندگی بخش ورزش: روزانہ باقاعدہ اس قسم کی ورزش کرنا جس سے تمام جسم کے اعضا حرکت میں آئیں اور جسم میں لچک قائم رہے۔ ورزش نہ تو کسی ایک خاص عضو کی ہو اور نہ ہی تھکا دینے والی ہو۔ پچاس برس کی عمر کے بعد کھلے میدانوں میں سیر کرنا بہترین ورزش اور صحت مند عادت ہے۔

۸۔زندگی بخش غسل: جسم کو پانی سے صاف کرنا، ٹھنڈی ہوا، آکسیجن پہنچانا، دھوپ اور روشنی پہنچانا، بارش میں نہانا، ٹھنڈے پانی سے غسل کے مقابلہ ٹھنڈی ہوا کا غسل زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

۹۔مسکرات یعنی نشیلی چیزیں: تمباکونوشی، چائے، قہوہ سے پرہیز کرنا چاہئے۔ تھوڑی مقدار میں زیادہ نقصان تو نہیں دیتے لیکن پرہیز زیادہ مفید ہے۔

۱۰۔حواس خمسہ کی درستی: آنکھ، کان، ناک، زبان اور دانت وغیرہ کی صفائی اور حفاظت رکھنا چاہیے کیونکہ ان میں سے کسی ایک بھی چیز کے کمزور ہونے سے زندگی پر اثر پڑتا ہے۔

۱۱۔جسمانی قوت کا درست استعمال: پاکیزہ خیالات اور نیک نیتی کے ساتھ جسمانی قوت کا جائزہ اور مناسب استعمال دماغی صلاحیت کو جلا دینے کا موجب ہے۔ اس سے متمتع ہونا چاہئے۔

۱۲۔آرام وسکون: فرائض کی پوری ادائیگی کے بعد جسم اور دماغ کو آرام دینا اور گہری نیند لینا عمر کو بڑھانے کا خاص جزو ہے۔ یہ ہیں جوانی کی سیڑھیاں۔ یہ سیڑھیاں آپ کو جوانی کے محل کی چھت پر پہنچا کر زندگی کے دلکش نظاروں کو دیکھنے کا موقع دے سکتی ہیں۔

درس قرآن

من قتل نفسا بغیرنفس او فساد افی الارض فکانماقتل الناس جمیعا و

من احیاھا فکانمااحیاالناس جمیعا

جس کسی نے کسی نفس کو بدلے کے بغیر قتل کیا یا زمین میں فساد برپا کیا گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کردیا اور جس نے کسی کی زندگی بچالی گویا تمام انسانوں کو زندہ کردیا۔

تفسیر و تشریح

حقوق انسانی کے سلسلہ میں جس آیت کو موضوع بنایا گیا اس میں یہ بات سوچی گئی کہ سب سے پہلے انسان کا انسان پر زندہ رہنے یا زندہ رکھنے کا حق بنتا ہے۔کیونکہ زندگی کا احترام اور اس کی حفاظت کے بعد دوسرے حقوق مفید اور موثر ہو سکتے ہیں۔اگر انسان کے دل میں دوسروں کی زندگی کی قدر و قیمت ہی پیدا نہ ہو پھر دوسروں کے حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسے ادا کرے۔اہل مغرب انسانی حقوق کی نسبت میگنا کارٹا سے لے کر دنیا کو یہ باور کراتے آرہے ہیں کہ یہ سہرا صرف ان کے سر ہے۔حالانکہ یہ اسلام سے چھ سو برس بعد کی بات ہے۔سترہویں صدی سے پہلے اہل مغرب میں انسانی حقوق کا کوئی تصور بھی نہ تھا۔اٹھارہویں صدی کے آخر میں امریکہ وفرانس کے دستوروں میں انسانی حقوق کا ذکر ہے اور وہ بھی ان حقوق کا ذکر کاغذوں میں ملتا ہے۔زمین پر چلتے پھرتے زندہ انسانوں میں اس کا نہ کوئی ثبوت ہے اور نہ وجود۔

اسلام اور انسانی حقوق: موجودہ صدی میں اقوام متحدہ' جسے اقوام متفرقہ بلکہ مفسدہ کہنا زیادہ موزوں ہے نے انسانی حقوق کا اعلان کیا اور نسل کشی کی قرارداد منظور کی' لیکن یہ ضابطہ بھی اس کے دوسرے ضابطوں کی طرح واجب العمل نہ بنا۔اس کے انسانی حقوق

ہر جگہ پامال ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اسلام کے انسانی حقوق نہ کسی ملک نے دیئے ہیں نہ کسی ادارے نے دیئے ہیں بلکہ یہ حقوق خود خدا تعالیٰ نے انسانوں کو دیئے ہیں۔ ان میں تبدیلی و تنسیخ یا واپس لینے کا کوئی امکان نہیں ہے اور نہ یہ حقوق نمائشی اور دکھاوے کے ہیں کہ اہل مغرب کی طرح دے کر لے لئے جاتے ہیں یا ان کے خلاف خود عمل کرتے رہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے ان حقوق کو جب اہل اسلام یا اسلامی حکومت بحیثیت مسلمان مانے گی اور انہیں ہر قیمت وہر حال میں تسلیم کرنا پڑے گا اور اگر ان میں ترمیم و تنسیخ کر کے اپنے قوانین بنائے گی اور انہیں نافذ کرے گی تو ایسی حکومت کے متعلق خدا تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ و

من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك ھم الکفرون ۔ ھم الظالمون ‘ھم الفاسقون

اس کا مطلب یہی ہے کہ جو حکومتیں اسلام کی دعویدار ہو کر اپنے قوانین بنائیں اور اپنے قوانین کو برحق سمجھ کر خدا کے قوانین کو رد کر دیں تو وہ کافر ہیں ۔ ظالم ہیں اور فاسق ہیں ان کا اسلام سے تعلق نہ ہوگا۔ خدا کے قوانین اور حقوق دائمی اور اٹل ہیں۔ ان کے خلاف اپنے قوانین نافذ کرنے والی حکومت خدا کی اطاعت سے نکلی ہوئی اور حق کے خلاف عمل پیرا سمجھی جائے گی۔

خالص انسانی حقوق: جیسا کہ عنوان میں دی ہوئی آیت کے الفاظ اور ترجمہ سے ظاہر ہے‘ اسلام انسان کے حقوق انسانوں پر لاگو کرتا ہے۔ اس میں اپنی قوم‘ اپنے ملک اور اپنے مذہب کا کوئی ذکر نہیں ۔ یہ انسان کہیں بھی بستا ہو‘ کسی قوم‘ ملک اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو‘ شہری ہو یا دیہاتی ‘جنگلوں میں رہتا ہو‘ یا صحراؤں کا باشندہ ہو کسی کی کوئی تمیز نہیں‘ سب بحیثیت انسان کے اس حق میں شریک ہیں اور وہ حق زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کا حق ہے۔

1-زندگی کا حق: اگر کوئی انسان دوسرے انسان کو بغیر انسانی جان کے بدلے کے مارے گا‘ قتل کرے گا تو وہ گویا زمین میں فساد برپا کرنے کا مجرم ہوگا اور یہ کہ اس طرح وہ تمام

انسانوں کا قاتل ہوگا۔انسانی جان کے بدلے کا جواز بھی اسی وقت پیدا ہوگا کہ کوئی عدالت اس کا فیصلہ کرے گی کہ اس کا قتل جائز ہے اور مبنی بر انصاف ہے ورنہ انفرادی طور پر یا جوابی طور پر یہ حق بھی کسی فرد کو حاصل نہیں کہ اس کا مارنا حق ہے **لا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق** کسی نفس کو قتل نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے سوائے اس کے کہ اس کا مارا جانا حق پر ہو۔ گویا حق کے ساتھ قتل کو مستثنیٰ کر دیا ہے، مگر حق کا فیصلہ عدالت کرے۔ ذاتی طور پر کسی کو بھی حق اور ناحق کے فیصلے کا اختیار نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے قتل انسانی کو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

ان دونوں قرآنی آیات میں نفس کا استعمال ہوا ہے جو تمام نفوس کے لئے ہے۔ اپنی قوم، ملک، رنگ ونسل اور مذہب کے امتیاز اور فرق کے بغیر تمام انسانوں کا ایک دوسرے پر قتل نہ کرنے کا یہ حق صرف اسلام کی خصوصیت ہے اور اس رب کائنات کی، جس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے اور اسی نے اپنے سچے دین اسلام میں اپنے ماننے والوں کو بالخصوص اور تمام انسانوں کو بالعموم یہ حق دیا ہے۔ خیال رہے کہ اسلام میں کسی دوسرے نفس کو مارنا بغیر حق کے بڑی بات ہے خود انسان کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خودکشی کرے اور اپنے نفس کو عذاب دے۔ برخلاف اس کے اسلام کے منکر اہل مغرب کے دستوروں میں کسی جان کو نہ مارنے کا حق صرف اپنے شہریوں اور سفید نسل کو حاصل ہے۔ انہوں نے آسٹریلیا کے باشندوں کا قتل عام کر کے اپنی نسل کے لئے زمین خالی کی۔ امریکہ میں پرانے باشندوں کی نسل کشی کر کے یا دوسرے علاقوں میں قید کر کے ان کے گھروں میں گھس کر جانوروں کی طرح انہیں ہلاک کیا گیا۔ اہل مغرب میں انسانی جانوں کا احترام موجود ہی نہیں۔ اگر ہے بھی تو صرف اپنی قوم اور رنگ والوں کے ساتھ ہے لیکن اسلام نے یہ حق تمام انسانوں کو دیا ہے۔

2-جان کی حفاظت کا حق: اگر چہ جان کی حفاظت کا حق اوپر بیان ہونے والی آیت کے اس حصہ کی تشریح اور تفصیل میں آ چکا ہے تا ہم اس آیت کے دوسرے حصے میں و من احیا ھا فکا نما احیا الناس جمیعا جس نے کسی نفس کو بچالیا تو اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخش دی کے ذیل میں موت سے بچانے کا یہ مطلب ہی نہیں کہ کسی کے قتل سے باز آ گیا بلکہ اس کی مختلف صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔ بیمار ہے تو اس کی بیماری میں امداد کر کے' یا زخمی پڑا ہوا ہے تو قطع اس بات کے کہ وہ کون ہے' خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو' اس کی بروقت امداد کر کے اس کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ اس کی بیماری اور زخموں کا علاج کیا اور کرایا جائے۔ بھوک سے مر رہا ہے تو کھانا کھلا کر اسے بچایا جا سکتا ہے۔ ڈوب رہا ہو تو فرض یہ ہے کہ اسے حتی الامکان خود کو خطرے میں ڈال کر بچایا جا سکتا ہے۔ جلتے ہوئے مکان میں گھرا ہوا ہے تو اس کے بچاؤ کی امکانی تدبیر اور جل مرنے کا تدارک کیا جا سکتا ہے یا اور بے شمار صورتیں ہیں جن کی وجہ سے کسی کی جان کو خطرہ ہے تو اس کی جان بچانا مسلمان کا فرض ہے۔ یہ نہ دیکھا جائے کہ کس مذہب اور قوم یا رنگ کا ہے۔

یہودیوں کی کتاب تلمود میں یہ حق صرف اسرائیل کو دیا گیا ہے "جس نے اسرائیل کی جان کو ہلاک کیا' الکتاب کی نگاہ میں ساری دنیا کو ہلاک کیا' جس نے اسرائیل کی جان کو محفوظ کیا' اس نے ساری دنیا کی حفاظت کی" عجیب بات ہے کہ صرف اسرائیل کو ہلاک کرنے اور اسرائیل کی جان کو محفوظ کرنے کے ساتھ "ساری دنیا" کے الفاظ کا تکلف کیوں برتا گیا۔ وہاں بھی اسرائیلی قوم کا ذکر کیا جاتا تو کیا مضائقہ تھا۔ اسی کتاب میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ جس نے غیر اسرائیلی کو ڈوبنے سے بچالیا اس نے گناہ کیا۔ قرآن کریم اپنے ماننے والوں کو ہر انسان کی جان بچانے کا حکم دیتا ہے' لیکن یہودیوں کا مذہب اور ان کی مذہبی کتاب

صرف اسرائیلیوں کو بچانے کا حکم دیتی ہے۔قرآن کریم میں یہودیوں کی اس ذہنیت کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔لیس علینا فی الامیین سبیل ہم اسرائیلیوں پر غیر یہودیوں کا مال کھانے پر کوئی گرفت نہیں۔

3-عورتوں کی عصمت کی حفاظت کا حق: اسلام کے انسانی حقوق میں عورتوں کی عصمت کا احترام اہم چیز ہے خواہ وہ عورت کسی بھی قوم' ملک اور مذہب کی ہو۔اپنے شہر کی ہو یا غیر کے شہر کی کسی حالت میں بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔اسی لئے زنا کو قطعاً حرام قرار دیا گیا ہے اور فرمایا لا تقربوا الزنی زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو۔اس فعل کی سزا مقرر ہوئی' جس سے کوئی بھی مسلمان بچ نہیں سکتا اور زنا کا فعل نکاح کے بغیر کسی بھی ملکی یا غیر ملکی' قومی یا غیر قومی' مذہب سے متعلق ہو یا غیر مذہب سے ہو عورت کے ساتھ مباشرت پر بولا جاتا ہے۔عورت کی عصمت کا یہ احترام اسلام کے علاوہ کہیں نہیں پایا جاتا۔اہل مغرب کی تہذیب اور ممالک میں مرد و زن کا روزانہ اختلاط بالکل جانوروں' سوروں اور کتوں کی طرح عام ہے۔عام شہریوں سے ہٹ کر مغربی ممالک کی فوجوں کی جنسی ضرورت کے لئے خود اپنی قوم کی لڑکیاں مہیا کی جاتی ہیں۔غیر قوم کے ساتھ جنگ کی صورت اور ان کے شہروں پر قبضے میں اس ملک اور قوم کی عورتوں کا جو حشر ہوتا ہے کسی سے پوشیدہ نہیں۔مسلمانوں کی تاریخ ''انفرادی غلطیوں سے قطع نظر'' اس قسم کی فوجی زرمستیوں سے خالی ہے اور نہ مسلمان فوجیوں کے لئے ''فاحشات'' کی بہم رسانی ہوئی ہے۔یہ تحفظ' عزت اور احترام دنیا کی عورتوں کو صرف اسلام نے دیا ہے۔اہل مغرب تو خلائی سفر کے چند روزہ دنوں کے لئے بھی مردوں کے ساتھ ایک آدھ لڑکی کا بھیجنا ضروری جانتے ہیں۔

4-انسانی آزادی کا حق: اسلام میں کسی کو پکڑ کر غلام بنانا' اس کی آزادی چھیننا یا

خرید کر بیچنا حرام ہے ۔حضورﷺ کا ارشاد ہے ۔تین قسم کے لوگوں کے خلاف مقدمات میں قیامت کے دن میں خود مدعی ہوں گا۔ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی آزاد انسان کو پکڑ کر بیچے اوراس کی قیمت کھائے رجل باع حرا فاکل ثمنہ جس نے آزاد کو بیچا اور قیمت کھائی۔ کے الفاظ بھی عام انسانوں کے لئے ہیں ان میں کسی قوم ٗنسل ٗرنگ اور وطن کی تخصیص نہیں ہے اہل مغرب اس دعویٰ پر بڑا ناز کرتے ہیں کہ غلامی کے انسداد کا کارنامہ صرف انہوں نے انجام دیا ہے۔انہیں یہ توفیق پچھلی صدی کے وسط میں ہوئی۔حالانکہ اس سے پہلے وہ افریقہ سے پکڑ پکڑ کر انسانوں کو اپنی آبادیوں میں لے جاتے رہے اوران سے جانوروں سے بدتر سلوک کرتے رہے ٗجس کے ذکر سے خود انہی کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

امریکہ اور مغربی ہندوستان کے جزیروں پر ان کا قبضہ ہوا تو ساڑھے تین سو سال تک یہ لوگ غلامی کی ظالمانہ تجارت کرتے رہے ۔افریقہ کے جس ساحل پر ملک کے اندرونی حصوں سے سیاہ فام لوگ پکڑ پکڑ کر لائے جاتے تھے۔اس ساحل کا نام ہی ساحل غلاماں SLAVEDOAST پڑ گیا تھا۔1680ء سے 1772 تک ایک صدی میں برطانوی مقبوضات کے جو آدمی پکڑ کر لے جائے گئے ان کی تعداد خود برطانوی مصنفین نے دو کروڑ بتائی ہے۔1790ء کے سال میں جو افریقی غلام بنائے گئے ان کی تعداد 75 ہزار ہے جن جہازوں میں انہیں لے جایا جاتا تھا ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ٗنہ ڈھنگ کی غذا دی جاتی ٗ نہ بیماری و زخمی حالت میں علاج ہوتا ۔ان مغربی مصنفین کے اپنے قول کے مطابق بیس فیصد افریقی باشندے راستے میں مر جاتے تھے ۔مجموعی طور پر ایسے جبری غلاموں کی تعداد دس کروڑ بتائی گئی ہے۔افسوس یہ ہے کہ یہی اہل مغرب اسلام اور مسلمانوں پر غلامی کا الزام لگاتے ہیں یعنی چھاننی کوزے کو دو سوراخوں کا طعنہ دیتی ہے یا کوئی نک کٹا

چھوٹی ناک والے کا مذاق اڑائے۔

1-اسلام میں غلامی کی حیثیت: اس میں کچھ شک نہیں اسلام سے پہلے عربوں میں غلام رکھنے اور ان کی خرید وفروخت کا رواج تھا' لیکن اسلامی حکومت کے قیام کے بعد غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب اور تحریص دی گئی۔ کہیں گناہوں کے کفارہ کے طور پر غلام آزاد کرنے کا حکم دیا' کہیں ان کی آزادی کا بہت زیادہ ثواب اور اجر بتایا گیا۔ اس حد تک فرمایا کہ غلام آزاد کرنے والے کا ہر عضو غلام اعضاء کے بدلے میں جہنم کی آگ سے محفوظ ہوگا اسلام کی اس تعلیم وترغیب کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت راشدہ کے دور تک تمام پرانے غلام آزاد ہو گئے۔ یہ کاغذی دستور اور اعلانات نہ تھے بلکہ عملی دنیا میں نافذ اور جاری تھے۔ حضورﷺ نے 63' حضرت عائشہؓ نے 67' حضرت عباسؓ نے 70' حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے تیس ہزار غلام آزاد کیے۔ اسی طرح دوسرے صحابہ کرامؓ کے متعلق بھی تفصیل موجود ہے۔ اس طرح تیس سال میں غلامی کا مسئلہ حل ہوگیا۔ اس کے بعد جو غلامی کی شکل موجود رہی وہ جنگی قیدیوں کی تھی۔ جنگی قیدی بھی وہ غلام ہوتے جو قیدیوں کے باہمی تبادلے یا فدیہ دے کر آزاد ہونے والوں میں سے بچ جاتے تھے' انہیں اسلامی حکومت گرفتار کرنے والے فوجیوں میں تقسیم کر دیتی تھی جو ان کے مالک ہوتے۔ یہ طریقہ اہل مغرب کے جنگی قیدیوں سے زیادہ بہتر تھا جو قیدیوں کو باڑوں میں بند کر دیا جاتا اور جن سے جبری مشقت لی جاتی تھی ایسی جنگی قیدی عورتوں کو قحبہ گری کے لئے مختص کر دیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کے برعکس ایسے جنگی قیدیوں کو معاشرے میں تقسیم کر کے افراد سے افراد کا سابقہ پیدا کر دیا اور مالکوں کو حکم دے دیا کہ ان سے بہتر اور نیک سلوک کیا جائے۔ اسی بہتر اور نیک سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم قوموں کے ان جنگی قیدیوں میں سے اکثر

مسلمان ہوئے اور ان کی اولادوں میں سے ائمہ ٔفقہا ٔمجتہدین اور نامور محدث پیدا ہوئے بلکہ سلطنتوں کے مدبر فوجوں کے سپہ سالار اور آگے چل کر وہ مسلمانوں کے حکمران بھی بنے۔ مغربی قوموں نے جنگ عظیم دوم میں خود روس نے جرمنی اور جاپان کے جنگی قیدیوں کا وہ حشر کیا کہ آج تک پتہ نہیں کہ ان کا کیا ہوا۔ان سے جو خدمات لی گئیں وہ غلاموں سے بھی بدتر تھیں۔ سائبیریا اور دوسرے غیر ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی ان جنگی قیدیوں کی شدید جبری خدمات کی مرہون منت ہے۔

5-انصاف کا حق: اسلام نے قطع نظر اس کے کہ کوئی انسان کس قوم ٔملک اور مذہب کا ہے اسے پورا پورا انصاف دیا ہے۔**ولا یجرمنکم شنان قوم علی الاتعد لو اعدلو اھواقرب للتقوی** خبردار کسی قوم کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرو ٔ انصاف کرو یہی تقویٰ کے قریب ہے۔معلوم ہوا کہ عام انسانوں سے ہی نہیں بلکہ دشمنوں تک سے بھی انصاف کرنا انصاف اور تقویٰ کی علامت ٹھہرایا۔اسلامی تاریخ میں سینکڑوں واقعات ایسے ہیں کہ خلفائے راشدینؓ اور دوسرے حکومتوں کے سربراہوں نے کسی سے اپنا حق بھی اپنے اختیارات سے کام لے کر حاصل نہیں کیا بلکہ عدالتوں سے رجوع کر کے حاصل کیا یا ان کے خلاف کسی نے دعویٰ کیا تو انہوں نے عدالتوں میں حاضری دی اور عدالتی فیصلہ کو تسلیم کیا ہے حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ نے یہودی کے خلاف زرہ کی چوری کا مقدمہ دائر فرمایا جو یہودی کے حق میں ہوا۔حضرت عمر فاروقؓ کے خلاف حضرت ابی بن کعبؓ کا مقدمہ وغیرہ۔ اسلام جس انصاف کی دعوت دیتا ہے وہ ملک کے باشندوں ٔاپنی قوم کے لوگوں اور اہل اسلام کے ساتھ ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے ہے۔

6-برسرپیکار دشمنوں کا حق: جنگی تہذیب اور قانون اہل مغرب میں سرے سے موجود

نہ تھا اور نہ اب ہے۔اہل مغرب جنگ کے دوران ہر طرح کا ظلم روا رکھتے ہیں ۔برسر پیکار اور برسر جنگ قوم کے حقوق نہ مانے جاتے ہیں نہ انسانی ہمدردی اور انسانی اخلاق کا اظہار ہوتا ہے'اگر برسر پیکار قوموں میں کوئی قواعد وضوابط بنتے بھی ہیں تو وہ ان کے درمیان معاہدہ کی صورت ہوتی ہے دوسری قوموں کے لئے واجب العمل نہیں ہوتے'بلکہ ہر جنگ میں ان بین الاقوامی ضوابط کے پرزے اڑائے جاتے ہیں ۔اس کے برعکس اسلام کی جنگی تہذیب اور قانون خدا اور رسول ﷺ کے دیئے ہوئے ہوتے ہیں۔جنہیں ماننا اور عمل کرنا مسلمان فوجوں جرنیلوں اور حکمرانوں کا دینی فریضہ بھی ہوتا ہے ۔جن کی مندرجہ ذیل تھوڑی سی تفصیل سے اندازلگایا جاسکتا ہے۔

1۔غیر مقاتلین کے حقوق: اسلام نے سب سے پہلے یہ فرق قائم کیا کہ دشمن ملک اور ملک کے مقاتل اور غیر مقاتل سے کیا سلوک کیا جائے یعنی مقاتل جنگ میں حصہ لینے والے فوجی یا شہری اور غیر مقاتل جنگ میں نہ لڑ سکنے والے شہری جن میں عورتیں بچے بوڑھے بیمار اور اپاہج شامل ہیں ان سے کیا سلوک کیا جائے ۔حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے **لا تقتلو اشیخا فانیا ولا طفلا صغیر اولا امراۃ** کسی بوڑھے بچے اور عورت کو قتل نہ کرو۔پھر فرمایا **لا تقتلوا اصحاب الصوامع** خانقاہ نشین راہبوں کو قتل نہ کرو یعنی عبادت گاہوں میں مقیم یا بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہ مارو ۔جنگ کے ایک موقعہ پر حضور ﷺ نے ایک عورت کی لاش دیکھی تو فرمایا ، یہ تو نہیں لڑ رہی تھی ؟اس سے فقہا اسلام نے اصول وضع فرمایا۔ جو لوگ غیر مقاتل ہوں انہیں قتل نہ کیا جائے ۔کیا آج جنگی ہتھیاروں کے باعث ایسا ممکن ہے ۔فوجی ٹھکانوں اور چھاؤنیوں کی بجائے شہری آبادیوں پر بم نہیں پھینکے جاتے ۔عراق میں لاکھوں ٹن بارود نے کتنی شہری آبادی اور انسانی جانوں کا نقصان کیا۔کشمیر میں عورتو ں کے ساتھ کتنا

انسانیت سوز سلوک ہو رہا ہے اور ہیروشیما اور ناگا ساکی کے ایٹم بم آج بھی مغربی تہذیب اور اقوام اپنے دامن کے اس داغ سے شرمندہ ہوں گے۔

2۔مقاتلین کے حقوق: یہی نہیں بلکہ جنگ میں لڑنے والوں کو اسلام نے حقوق دیئے ہیں۔انہیں آگ کا عذاب نہ دیا جائے۔یعنی دشمن کی بستیوں کو نہ جلایا جائے۔انہیں آگ میں نہ جھونکا جائے۔زخمی ہونے والے پر حملہ نہ کیا جائے۔زخمی پر حملہ نہ کرو۔جولڑنے کے قابل نہ رہا اور نہ عملاً لڑ رہا ہے۔قیدی کو قتل نہ کیا جائے۔نبی ﷺ نے باندھ کر یا بندھے ہوئے قیدی کے قتل سے منع فرمایا ہے۔حضرت ابوایوب انصاری جنہوں نے یہ روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں۔جس خدا کے ہاتھ میں میری جان ہے اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کسی مرغ کو بھی باندھ کر ذبح نہ کروں گا۔

3-غارتگری اور لوٹ مار: اسلام نے بر سرِ پیکار قوم اور ملک کو یہ حق بھی دیا ہے کہ ان کے شہروں میں داخل ہوں تو لوٹ مار نہ پھیلائی جائے بستیوں کو ویران نہ کیا جائے کسی شخص کے مال پر ہاتھ نہ ڈالا جائے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ لوٹ مار کا مال مردار سے زیادہ حلال نہیں یعنی مردار کی طرح حرام ہے۔حضرت ابو بکر صدیق فوجوں کو روانہ فرماتے وقت ہدایات دیتے۔بستیوں کو ویران نہ کرو کھیتوں اور باغوں کو برباد نہ کرو،مویشیوں کو ہلاک نہ کیا جائے مال غنیمت کا معاملہ الگ ہے۔یہ وہ مال ہوتا تھا جو دشمن فوجوں کے لشکروں فوجی کیمپوں اور چھاؤنیوں سے ملتا تھا۔یہ شہری آبادی کا مال نہ ہوتا تھا۔

4-مفتوح کا مال مفت نہ لینا: جو آبادی اسلامی فوج کے قبضہ میں آجاتی یا سر راہ آبادی کے قریب کیمپ لگتا تو اسلامی فوج کو حکم تھا کہ کوئی چیز زبردستی نہ چھینی جائے اگر ضرورت پڑے تو معاوضہ ادا کیا جائے۔اپنے قیام کے دوران شہریوں کی چیزوں کا استعمال نہ کر وحتی کہ مالکوں

کواس کی قیمت ادا کی جائے بلکہ خلیفہ اولؓ یہاں تک فرماتے کہ شہریوں کے دودھ دینے والے جانوروں کا دودھ بھی تم نہیں حاصل کرسکتے جب کہ مالک اجازت نہ دے۔

5-لاشوں کے احترام کا حق: نبی کریم ﷺ نے دشمن کی لاشوں کی بے حرمتی اور تذلیل سے منع فرمایا۔مثلہ یعنی لاشوں کے اعضاء کی قطع برید سے روکا ہے۔حالانکہ یہ حکم ایک انتہائی جذباتی اور انتقامی جوش وجذبہ کے موقعہ پر دیا گیا ہے جب جنگ احد میں حضور ﷺ کے چچا حمزہؓ اور عبداللہ بن جحشؓ شہید ہوئے تو ان کی لاشوں کا مثلہ کیا گیا۔انکے ناک کان کاٹ کر ہار بنائے گئے۔پیٹ چاک کر کے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبانے کی کوشش کی گئی۔ایسے جذباتی انتقامی اور اشتعال انگیز موقعہ پر بھی حضور ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا کہ تم دشمن کی لاشوں سے یہ سلوک نہ کرو۔دین اسلام کی سچائی اور خدا کے فرستادہ دین ہونے کی بڑی دلیل ہے جس میں انسانی جذبات واشتعال کا کوئی دخل نہیں اگر انسانی جذبات کو دیکھا جاتا تو ایسے موقعوں پر بستیوں کی بستیاں تباہ کردی جاتیں۔

6-دشمن کی لاشیں ان کے حوالے کرنا: جنگ احزاب میں دشمن کی فوج کا مشہور شہسوار خندق میں گر کر ہلاک ہوگیا تو کفار نے حضور ﷺ کے سامنے دس ہزار دینار پیش کئے کہ اس کی لاش لے جانے کی اجازت دی جائے۔حضور ﷺ نے فرمایا میں مردے فروش نہیں ہوں۔آپ لاش بے شک لے جائیں۔

7-بدعہدی کی ممانعت: حضور ﷺ اسلامی فوجوں کی روانگی کے وقت سخت تاکید فرماتے **لاتغدروا** بدعہدی نہ کرنا' اسلام میں ویسے بھی وعدہ خلافی کی سخت ممانعت ہے۔قرآن مجید اور احادیث میں اس کی باربار تاکید فرمائی ہے۔دشمن اگر جنگ کے دوران ایسا کرتا ہے تو کرے لیکن مسلمان ایسا نہیں کرسکتا۔صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ہے کہ صلح نامے کی

شرائط کے مطابق اسی وقت مسلمان نوجوان حضرت ابو جندلؓ جن کا والد ابھی صلح کی تحریر کے بعد بیٹھا ہوا تھا' بیڑیوں میں جکڑے ہوئے کفار مکہ کے نرغے سے بھاگ کر آ گئے اور مسلمانوں سے اپنے بچاؤ کی فریاد کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم صلح نامے کی اس شرط کے مطابق تمہیں کفار کو واپس کرنے پر مجبور اور پابند ہیں۔ خدا تمہارے لئے کوئی راستہ نکالے گا ان کی حالت زار اور اس وقت کی بے بسی دیکھ کر سب صحابہ کرامؓ رو پڑے۔ لیکن حضور ﷺ نے اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں فرمائی۔ تو صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد کے باوجود کوئی ہاتھ بھی ان کی مدد کو نہ اٹھ سکا اور نہ قدم آگے بڑھا۔ چنانچہ کفار مکہ سب مسلمانوں کے سامنے انہیں گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ تاریخ اسلام میں اس قسم کے وعدوں کی پابندی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں

8۔اظہار رائے کی آزادی کا حق: اظہار رائے کی آزادی کا حق اس شرط کے ساتھ ہے کہ تعمیری ہو' بھلائی اور اخلاص کے ساتھ ہو۔ تخریب اور برائی کے لئے نہ ہو۔ تنقید کے نام سے دشنام طرازی اور الزام تراشی نہ ہو۔ برائی کی اشاعت کے لئے نہ ہو۔ بھلائی کی اشاعت صرف حق ہی نہیں فرض ہے اور برائی سے منع کرنا بھی فرض ہے۔ برائی کوئی فرد کرے یا گروہ' ملکی ہو یا غیر ملکی یا دوسری قوم کر رہی ہو "تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر کا قرآنی اور خدائی اجازت نامہ ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کوئی شخص برائی کو دیکھے تو ہاتھ سے روکے۔ ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے' یہ بھی نہ کر سکے تو دل میں برائی کو برا جانے۔ حکومت اگر اس اظہار کے راستے کو روکے اور کسی کو یہ حق ادا نہ کرنے دے تو گویا وہ حکومت خدا اور رسول ﷺ سے مقابلہ کر رہی ہے۔

9۔اعتقاد کی آزادی کا حق: اسلام اپنی مملکت میں لوگوں کو اعتقاد کی آزادی کا حق دیتا ہے۔ قرآن پاک میں واضح ارشاد ہے لا اکراہ فی الدین دین میں کوئی زور اور زبردستی نہیں

اگر چہ دین حق بجائے خود حق ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کی دعوت فرض ہے' مگر یہ حق دوسروں پر زبردستی مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ جو شخص دلائل اور دین کی سچائی سے متاثر ہو کر مان لے تو اسے سینہ سے لگانا چاہئے' اگر نہ مانے تو اسے اپنے اعتقاد کے مطابق عمل کی آزادی کا حق دیا گیا ہے۔ **لا اکراہ فی الدین قلتبین الرشد من الغی** ۔ دین میں زبردستی نہیں۔ جب دین سرکشی سے جدا ہو گیا تو جس کی مرضی ہے دین اپنائے۔

10۔مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق: غیر مذہب والوں کو یہ حق بھی دیا گیا ہے کہ ان کے اعتقاد کے مطابق ان کی دل آزاری نہ کی جائے۔ قرآن کا ارشاد ہے **ولا تسبعوا الذین یدعون من دون اللہ** جن معبودوں کو یہ مشرک خدا کے سوا پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو۔ معاملہ بتوں تک ہی نہیں۔ بلکہ اس قوم کے بزرگوں' پیشواؤں کے لئے بھی یہی حکم ہے انہیں گالیاں دے کر انہیں برا بھلا کہہ کر انکا دل نہ دکھایا جائے۔ مذہبی بحث مباحثہ ضرور مگر تہذیب اور شائستگی کے ساتھ ہو **ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن** اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو البتہ مباحثہ احسن انداز سے کرو۔

11۔ حاجتمندوں اور محروموں کا حق: حاجت مندوں کی دستگیری اور امداد کا حق دیا گیا ہے **وفی اموالھم حق للسائل والمحروم** مسلمانوں کے مال میں ہر محروم اور سائل کا حق ہے صرف اس بات کا حق نہیں کہ وہ مدد مانگیں تو انہیں مدد دی جائے بلکہ وہ مانگیں یا نہ مانگیں اگر کسی مسلمان کے علم میں یہ بات آ جائے کہ فلاں شخص ضروریات میں محروم اور حاجتمند ہے تو اس تک خود پہنچ کر مدد کرنا مسلمان کا فرض اور حاجت مند کا حق ہے۔ زکوٰۃ کی فرضیت' صدقات کی ترغیب کے علاوہ حکومت کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ کسی کا کوئی دستگیر نہ ہو اس کی دستگیری کرے۔ **السطان ولی لمن لا ولی لہ** حکمران اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔

حرف آخر: انسانی حقوق کا یہ مختصر نقشہ جو اسلام نے انسان کو دیا ہے اس میں دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ حقوق خدا اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر فرمائے ہیں جو اپنے ماننے والوں پر فرض کئے گئے۔ یہ کسی سوسائٹی معاشرے ادارے یا مجلس قانون ساز کے وضع کردہ نہیں ہیں کہ اِس ہاتھ دینے اور اُس ہاتھ لینے کا خطرہ موجود ہو اور ان حقوق کی قوت نافذہ اسلام کا اپنا عقیدہ اور ایمان ہے جو عام مسلمانوں یا حکمرانوں کو ان کی ادائیگی پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے برعکس یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندی اور روشن خیالی کے مدعی ان سے زیادہ منصفانہ قوانین نہیں بنا سکتے اور نہ اس سے بہتر حقوق پوری انسانیت کے لئے مقرر کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اس بات پر افسوس آتا ہے کہ جن کے پاس اتنے بلند پایہ اور منصفانہ قوانین موجود ہیں اور ہر دور میں پوری انسانیت کی فلاح و بہبود اور راہنمائی کے مدعی بن سکتے ہوں وہ اپنی راہنمائی اور ہدایت کے لئے ان قوموں اور ملکوں کی طرف ہدایات و رہنمائی کیلئے دیکھ رہے ہوں جن کے تصور میں بھی حق و انصاف کی اتنی بلندیاں نہیں آئیں اور نہ کبھی آ سکتی ہیں۔ اس بات پر افسوس آتا ہے کہ اسلام پر ایمان رکھنے والے مسلمان حکمران آج دنیا بھر میں اپنے خدا اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرتے ہوئے غیروں کے خود ساختہ قوانین پر اپنی حکومتوں کی بنیادیں استوار کر رہے ہیں۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**

(بشکریہ ! ماہنامہ خطیب)

انسان ،قرآن اور ماہ رمضان

(قبلہ محمد صدیق ڈار توحیدی)

جب تک انسان کی حقیقت اور اس کی زندگی کا مقصد معلوم نہ ہو دین اسلام کے احکام کی حکمت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی۔قرآن کریم کے مطالعہ سے انسانی زندگی کی جو حقیقت سامنے آتی ہے۔وہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا مادی دنیا سے نہیں ہوتی اور نہ ہی موت اس کا انجام ہے۔تمام انسانوں کی ارواح روز ازل ہی وجود میں آ گئی تھیں۔اللہ تعالیٰ کے ارادے کے مطابق اپنی اپنی باری پر اس دنیا میں آ کر جلوہ گر ہوتیں اور مقررہ مدت بسر کرنے کے بعد واپس چلی جاتی ہیں۔قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کا علم عطا فرما کر ملائکہ پر فضیلت عطا فرمائی لیکن ابلیس نے اس کی برتری تسلیم نہ کی اور اسے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔وہ نسل انسانی کا دشمن بن گیا اور اس کو صراط مستقیم سے ہٹانے کیلئے اپنی ذریت ، لاؤ لشکر اور تمام حربوں سے لیس پوری طرح مصروف عمل ہے۔اللہ نے حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو کچھ عرصہ کیلئے جنت میں رکھا تا کہ ان کی ارواح اپنی منزل سے آشنا ہو جائیں۔اللہ نے انہیں واضح طور پر ایک درخت سے دور رہنے کا حکم فرمایا لیکن ابلیس نے انہیں نافرمانی پر اُکسایا۔ابلیس نے خود بھی اللہ کے واضح حکم کے باوجود سجدہ نہیں کیا تھا اور منطقی دلائل پیش کرنے کی وجہ سے مردود ہو گیا۔اس نے ان دونوں کو بھی مختلف دلائل دینے شروع کئے اور ساتھ ہی قسمیں کھا کر اپنی خیر خواہی کا یقین دلا کر فریب دینے میں کامیاب ہو گیا لیکن ابلیس کے برخلاف جو اپنی غلطی پر اکڑ گیا آدم علیہ السلام نے ندامت کا اظہار کیا اور اللہ سے سیکھے ہوئے کلمات کے ذریعے سے مغفرت طلب کی اور اللہ نے انہیں معاف فرما دیا۔اس سے واضح ہو گیا کہ ازلی اور پیدائشی گناہ کا نظریہ درست نہیں ہے۔آدم علیہ السلام کو زمین

کی خلافت عطا کرنے کیلئے ہی پیدا کیا گیا تھا۔ اس لئے انسان کو اس مادی دنیا میں کسی جرم کی سزا بھگتنے کیلئے نہیں بلکہ اللہ کی عطا کردہ گونا گوں اہلیتوں کے اظہار اور اپنی شخصیت کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے۔عالم ارواح ہی میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت سے قیامت تک آنے والی تمام ارواح کو نکال کر ان سے اپنی ربوبیت کا پختہ عہد لے لیا تا کہ مادی دنیا کی بھول بھلیوں، عالم اسباب کے پردوں، نفس کی سرکشی اور سفلی لذت میں انہماک کی وجہ سے کوئی انسان اس وہم اور گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ میں بالکل آزاد اور اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ نہ کوئی میرا آقا اور رب ہے اور نہ ہی میں کسی کے سامنے اپنے اعمال کیلئے جوابدہ ہوں۔یا پھر اللہ کو چھوڑ کر اس کی مخلوق میں کسی کو اپنا رب بنا کر ظلم عظیم کا مرتکب ہو جائے۔ قرآن وضاحت کرتا ہے کہ یہ عہد اس لئے لیا گیا" تا کہ کوئی انسان روز قیامت یہ نہ کہہ سکے کہ مجھے تو اس کی خبر ہی نہ تھی ۔اور نہ ہی یہ بہانہ بنا سکے کہ آباؤاجداد کی گمراہی کی وجہ سے میں حقیقت کو نہ جان سکا"۔اگر چہ یہ عہد عام انسانوں کو شعوری طور پر ہرگز یاد نہیں لیکن روح کی گہرائیوں میں موجود ہے۔اور مرنے کے بعد جب مادے کے حجابات اُٹھ جائیں گے تو پھر سب کچھ یاد آ جائے گا۔حیات ارضی میں انسان کے طرز عمل اور اس کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس عہد الست کو تسلیم کر لینے یا اس سے انکار کر دینے پر ہے۔اللہ کی بے پایاں رحمت نے اس عہد پر ہی اکتفا نہ فرمایا بلکہ آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے سے پہلے فرما دیا کہ "میری طرف سے تمہیں ہدایت اور راہنمائی آتی رہے گی۔ جو اس پر چلیں گے نہ ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے اور جو لوگ میری آیات کو نہیں مانیں گے اور جھٹلائیں گے تو وہ لوگ آگ کے عذاب کے مستحق ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے"۔(البقرہ۔39,38)

اس مادی زندگی کی تربیت گاہ میں ہر چیز انسان کی سہولت اور خدمت کے لئے پیدا

کی گئی ہے۔اولادِ آدم کا فرض منصبی اور خلافت ارضی کا یہ تقاضا ہے کہ ان تمام چیزوں کو زیر نگیں کر کے اپنی اہلیت کو ثابت کر دے۔اس جدوجہد ہی میں اس کی روح کی ترقی اور شخصیت کی تکمیل کا راز بھی پوشیدہ ہے۔اسلام مادی دنیا سے بیزاری اور رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ اسے تسخیر کر کے آگے ہی آگے بڑھنے اور اللہ کو اپنی منزل بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

لیکن جو انسان متاع دنیا کو سب کچھ سمجھ کر اس تربیت گاہ ہی سے دل لگا لے اور اللہ کے رسولوں کی یاددہانی کے باوجود بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہ لائے وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔اب اس کی نگاہوں سے نہ صرف زندگی کا مقصد اوجھل ہو جائے گا بلکہ اپنی ذات کی حقیقت سے بھی بیگانہ ہو جائے گا۔ایسا انسان سفلی جذبات کی تسکین اور مادی لذات کے حصول میں غرق ہو کر حیوانوں کی سطح پر گر جاتا ہے۔حالانکہ انسان کی فلاح اس امر میں ہے کہ دنیا کی نعمتوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے بھی اس کی محبت میں مبتلا نہ ہو کیونکہ ساری خرابی دنیوی زندگی کو اُخروی زندگی پر ترجیح دینے میں ہے۔حضور نبی کریم ﷺ کا بھی فرمان ہے **حب الدنیا راس الخطیتہ** ''یعنی دنیا کی محبت ہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے''سب سے زیادہ محبت انسان کو اپنے اللہ سے کرنی چاہیے۔جو اس کا معبود اور محبوب ہے۔ سورۃ البقرہ آیت 165 میں ارشاد ہوا کہ ''جو لوگ ایمان والے ہیں وہ تو اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں''۔

صرف اس طرز فکر ہی سے انسان ماسوا اللہ کے خوف سے نجات پا کر حقیقی آزادی اور

اشرف المخلوقات کے مقام پر فائز ہوسکتا ہے۔علامہ اقبالؒ نے فرمایا:۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اگر انسان اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ میرا مالک، آقا اور رب اللہ تعالیٰ ہے۔اس نے موت وحیات اور زمین کی ساری نعمتیں میری تربیت اور آزمائش کیلئے تخلیق فرمائی ہیں۔مجھے اللہ کے پاس واپس لوٹنا ہے۔جہاں مادی دنیا میں میری کارکردگی کی مناسبت سے مجھے جزا یا سزا ملے گی۔تو وہ مومن یعنی حقیقت کو مان لینے والا کہلوائے گا۔اب اسے اپنی منزل کی فکر دامنگیر ہو جائے گی۔کہ کس طرح بھرپور دنیوی زندگی بسر کرتے ہوئے اور اپنی تخلیقی اہلیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دنیا کے منفی اثرات سے بچ کر اللہ کے قرب کی منزل کی طرف رواں دواں رہ سکے۔اس جذبہ کو تقویٰ کا نام دیا جاتا ہے۔اگرچہ اس کے معنی خوف ڈر اور پرہیزگاری کے بھی ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ اللہ کی محبت کی کشش کے معنی بھی اس میں پوشیدہ ہیں۔آپ آسانی کی خاطر تقویٰ کو "فکر منزل" کہہ لیں۔یہ فکر جس قدر قوی ہوگی اتنا ہی ایک مومن ان خواہشات ،لذات اور اعمال سے بچنے کی کوشش کریگا جو اسے اللہ کی یاد سے غافل کر دیں وہ اس جدوجہد میں لگ جائے گا کہ زندگی اللہ کی منشاء کے مطابق گذارے تا کہ اس کے قرب اور رضا کا مقام حاصل کر سکے۔اس طرح بنی نوع انسان دو بنیادی گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔اللہ کی الوہیت، رسولوں کی رسالت اور یوم آخرت کا انکار کرنے والے کفار کی ملت اور ان حقائق کو مان کر اللہ کی حاکمیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے مسلمانوں کی ملت۔اللہ کے نظام کے تحت کفار کی حمایت کرنے ،انہیں اندھیروں کی طرف لیجانے، ان کے برے اعمال کو اپنے فریب سے خوشنما بنا کر دکھانے اور عذاب دوزخ کی

طرف لے جانے والے شیاطین کی فوجیں موجود ہیں۔اس طاغوتی لشکر کا سرکردہ ابلیس ہے۔اس کے برعکس اہل ایمان کی راہنمائی کرنے اور انہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جانے والے رسولوں کا مبارک گروہ ہے۔جس کے سردار و سالار حضور ابد قرار، کالی کملی والی سرکار احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔مزید برآں اللہ تعالیٰ خود مومنوں کا مولا، حمائتی اور مددگار ہے۔اللہ اور اس کے فرشتے اہل ایمان کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جانے کیلئے ان پر رحمتوں کا نزول فرماتے ہیں۔(الاحزاب :42)

''اللہ تعالیٰ کے عرش کو اُٹھانے والے اور اس کے گرد جو فرشتے ہیں وہ اللہ کی تسبیح کرتے اور اہل ایمان کیلئے دُعائیں کرتے رہتے ہیں۔کہ اے اللہ مومنین کی مغفرت فرما انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا کر جنت میں داخل فرما۔اور جو ان کے باپ دادا اور انکی بیویوں اور اولاد میں سے نیک ہوں ان کو بھی جنت میں داخل فرما''۔(سورہ المومن 8,7)اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین پر کس قدر رحیم ہیں اور اپنی رحمت سے ان کی مغفرت کیلئے کیا کیا انتظامات کرر کھے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آخری زمانہ کے انسانوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکالنے،ان کی زندگی کی غرض و غایت سے آگاہ کرنے اور اپنے قرب کی طرف لے جانے والی سیدھی راہ کی نشاندہی کرنے کیلئے حضور خاتم النبیین ،رحمۃ اللعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا اور ان پر گذشتہ تمام کتابوں کی تصدیق کرنے والی، قیامت تک آنے والے انسانوں کو ہدایت مہیا کرنے والی اور کامل ترین نظام حیات پیش کرنے والی کتاب ''القرآن'' نازل فرمائی۔ اس کتاب کی فصاحت و بلاغت، اس کا انداز تبشیر وتنذیر، اس میں اللہ کی الوہیت اور ربوبیت پر دیے گئے نا قابل تردید دلائل،اس میں بیان کردہ قصص وامثال،گذشتہ اقوام وملل

کے حالات، آخروی زندگی کی حقیقت اوراس میں پیش آنے والے واقعات، نیکوکاروں اور مجرموں سے کئے جانے والے معاملات کی تفصیل اپنے اندر غافل دلوں اور خوابیدہ ضمیروں کو بیدار کرنے اور سینوں کو منور کرنے کے ہزار ہا سامان لئے ہوئے ہے لیکن اس سے صحیح راہنمائی اور ہدایت حاصل کرنے کیلئے سب سے بنیادی شرط تقویٰ کا ہونا ہے۔ جسے اپنے رب سے ملاقات ہونے کا یقین ہی نہ ہو اس میں صراط مستقیم معلوم کرنے کی طلب بھلا کیونکر ہوسکتی ہے۔ ہر شے کی قدر و قیمت طلب ہی سے متعین ہوتی ہے۔

اگر چہ انسانی تاریخ، فلسفہ، نفسیات، طبعیات، فلکیات اور رومانیات کے غیر مسلم علماء بھی اس کے مطالب و معنی کی گہرائی اور وسعت جان کر حیران و ششدر رہ جاتے اور اپنے اپنے علمی مقام کے مطابق اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کا اصل مقصد بنی نوع انسان کو ہدایت مہیا کرنا ہے اور اسے وہی حاصل کرسکتا ہے جس کے اندر تقویٰ، فکر منزل اور ذوق پرواز ہوگا۔ جو شخص اس جذبہ سے خالی ہو اس کا علم خواہ کتنا ہی متنوع اور وسیع ہو کر قرآن کی حقیقی روح سے ناآشنا اور اس سے فیضیاب ہونے سے محروم رہے گا۔ اس کتاب سے ہدایت کا اکتساب تقویٰ کے معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے جیسے ایک مومن میں تقویٰ بڑھتا چلا جاتا ہے ویسے ویسے قرآنی اسرار و رموز اور اسلام کی حقانیت کیلئے اس کا سینہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ اس سے یہ امر روشن ہو کر سامنے آگیا کہ قرآنی ہدایت اور تقویٰ میں ایک خصوصی ربط و تعلق ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا اور ترقی کرتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی روشنی میں اس کا جواب یہ ہے کہ اس خیر و خوبی کے مصدر کی خشت اول اسلامی طرز حیات کا راہنما اصول کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہے۔ یعنی انسان سچے دل سے یہ حقیقت تسلیم کر لے۔ کہ میرا معبود اور حاکم اللہ ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور ان کی

اطاعت اور اتباع ہی میں میری دنیوی اور اُخروی فلاح ہے۔تمام آسمانی کتابوں کا بنیادی پیام اور انبیا کی تعلیم کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی واحدانیت اور یوم آخرت پر ایمان لاکر موت کے بعد والی حقیقی اور ابدی زندگی کو دنیا کی عارضی زندگی پر ترجیح اور فوقیت دینا ہے۔اِن عبادات کی ادائیگی سے ایک مومن اپنا قلبی تعلق متاع دنیا سے توڑ کر اللہ کی ربوبیت کا زبانی اقرار اور عملی اظہار کرتا رہتا ہے۔مثال کے طور پر نماز ہی کو لےلیں جسے حضورؐ نے دین کا ستون اور جنت کی کنجی فرمایا ہے۔اس کے ذریعے سے مومن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنے گھر، اہل و عیال، کاروبار، ملازمت اور جسمانی راحت و آرام کی محبت کو توڑتا رہتا ہے۔تاکہ یہ تعلق پختہ ہو کر خسران کا باعث نہ بن جائے۔وہ متاع غرور اور بتان وہم و گمان سے اپنا رشتہ منقطع کر کے اللہ کے حضور اپنا سر نیاز خم کر کے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اسکی وفاؤں کا قبلہ اور محبت کا مرکز صرف اللہ سبحانہ تعالیٰ کی بابرکت ذات ہے۔اِسی طرح زکوٰۃ اور حج بھی مال و زر، اہل وعیال اور ارض وطن کی محبت کو مطلوبہ اعتدال پر لانے اور اللہ سے اپنا تعلق بڑھانے کے وسائل ہیں۔

قرآن کی سورۃ توبہ کی آیت نمبر 111 میں ارشاد ہوا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے اموال اور ان کی جانیں جنت کے بدلے خرید لئے ہیں"حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک حدیث مبارکہ بھی ہے کہ" تم اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنی خواہشات کو اس کے تابع نہ کرلو جو میں لایا ہوں"۔اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ اور ایمان کا اعلیٰ مقام یہ ہے۔کہ بندہ اپنی تمام خواہشات کو اپنے رب کی رضا کے ماتحت کر دے۔اس معیار کے حصول کیلئے نفس کے سرکش گھوڑے کو اطاعت کی مضبوط لگام دینا اور مادی لذات کی محبت کو منقطع کرنا نہایت ضروری ہے۔یہ اہم مقصد ایک مربوط اور پر از حکمت تربیتی نظام کا تقاضہ کرتا ہے۔چنانچہ اسی غرض کیلئے مومنین پر روزے فرض کئے گئے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا گیا کہ"

اللہ کی طرف سے یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے بلکہ گذشتہ تمام اُمتوں کو بھی نفس کی اصلاح کر کے تقویٰ کو تقویت دینے کیلئے یہی کارگر نسخہ عطا کیا گیا تھا۔ انسانی نفس کی یہ فطرت ہے کہ فاقے سے کمزور اور مضمحل ہو کر اپنی درندگی اور بہیمیت سے رُک جاتا ہے اور اس کی اس حالت سے فائدہ اُٹھا کر اسے اللہ کی اطاعت اور بندگی کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ درندوں کو سرکس میں مختلف کرتب دکھانے کی تربیت دینے کیلئے بھی پہلے انہیں کئی کئی دن بھوکا پیاسا رکھا جاتا ہے اور پھر اپنی خوراک تک پہنچنے کیلئے مطلوبہ کرتب کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس لئے مومنین کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ روزے کا مقصود بھوکا پیاسا رہنا نہیں بلکہ نفس کی اصلاح کرنا ہے۔ اس لئے اس مقصد کو شعوری طور پر پیش نظر رکھتے ہوئے، بھوک کی حالت میں جسم کے تمام اعضاء اور نفس کی خواہشات کو احکام الٰہی کا پابند بنا کر روزے سے حقیقی فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ تا کہ ایسا نہ ہو کہ حضور ﷺ کی اس حدیث کا مصداق ہم بن جائیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کئی روزہ دار ایسے ہونگے جنہیں روزے سے بھوک پیاس کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا“۔

آخر میں ان حکمتوں اور برکتوں کا ذکر کرنا ہے جو ماہ رمضان ہی کو ماہ صیام قرار دینے میں ہیں یہ سبھی جانتے ہیں کہ انسانوں کو ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب کے نزول کا شرف ماہ رمضان کو عطا ہوا۔ جس کی وجہ سے یہ مہینہ ہمیشہ کیلئے خصوصی رحمتوں اور برکتوں کا حاصل بن گیا ہے۔ اس مہینہ کی ایک خاص رات لیلۃ القدر کو ہزار مہینوں سے بہتر ہونے کی انفرادیت سے نوازا گیا۔ بعض روایات کے مطابق گذشتہ آسمانی کتابیں بھی اسی ماہ مبارک میں اتاری گئی تھیں اس مہینہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت ہی مہربان ہوتے ہیں۔ اسی لئے حضور ﷺ نے اسے خاص طور پر اللہ کا مہینہ فرمایا ہے۔ اللہ کی رحمت سے اس میں برائی کے اثرات کم اور نیکی

کےثمرات کئی گنا زیادہ کر دئے جاتے ہیں۔جہنم کے دروازے بند اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔اور شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔اس لئے نفس کو زیر کر کے روحانی قوتوں کو ترقی دینے یعنی تقویٰ کو فروغ دینے کیلئے اس ماہ سے بہتر مہینہ اور کونسا ہوسکتا تھا۔اس لئے ہماری سہولت کیلئے اللہ رحیم وکریم نے ماہ رمضان ہی کو ماہ صیام قرار دے دیا تاکہ اس کی رحمتیں اور برکتیں بھی ہماری معاون بن جائیں۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کیلئے قرآن نازل فرمایا لیکن اس نور سے استفادہ تقویٰ کی عدم موجودگی میں ممکن ہی نہیں چنانچہ قرآن کریم کے شروع میں فرما دیا گیا کہ اس کتاب میں متقین کیلئے ہدایت ہے۔اسی مناسبت سے قرآن کے نزول والے بابرکت مہینہ ہی کو تقویٰ کی ترقی کیلئے مخصوص فرما دیا گیا اسی لئے پورے عالم اسلام میں اس ماہ کے دوران کثرت کے ساتھ قرآن کی تلاوت اور سماعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔تاکہ روزے سے حاصل ہونے والی روحانی صلاحیت کی بدولت مومنین پر قرآن کی حقانیت روشن سے روشن تر ہوتی چلی جائے اور اسلام ان کے دلوں میں گھر کر جائے اور پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو کر اللہ کے انعام واکرام کے حقدار بن جائیں۔

ماہ صیام کی تربیت اگر پورے اہتمام اور ظاہری اور معنوی لوازمات کی کامل پابندی کے ساتھ مکمل کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ سال کے باقی گیارہ مہینوں میں اس کے اثرات قائم نہ رہیں۔اگر کبھی تقویٰ میں کمزوری محسوس ہونے لگے تو نفلی اور سنت روزہ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ روزہ ایک ڈھال ہے۔تو مومن کو چاہیے کہ اپنے حقیقی دشمن یعنی شیطان کے حملوں کو روکنے کیلئے اس دفاعی ہتھیار کو پوری قوت اور شدت سے استعمال بھی کرے۔جب بھی شیطان کی طرف سے کسی حرام کام کے ارتکاب

کیلئے دل میں وسوسہ پیدا ہوتو مومن کو چاہیے کہ ماہ رمضان کے دوران ضبط نفس کی تربیت کو یاد رکھے۔ یہی لمحہ مومن کے ایمان اور تقویٰ کے امتحان کا ہوتا ہے۔ جو مومن بندہ ماہ رمضان میں اپنے رب کے حکم پر روزے کے دوران حلال رزق اور جائز جنسی خواہشات سے بھی اپنے آپ کو روک لیتا ہے۔ اس کیلئے کسی حرام فعل کا ارتکاب یا اللہ کی معصیت سے اپنے آپ کو باز رکھنا تو آسان تر ہوتا ہے۔ ایسے ہی کردار کے حامل لوگ متقین کہلاتے ہیں۔ اور آخرت میں جنت کی نعمتیں بھی متقین کے لئے ہی وقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو رمضان المبارک کی برکتوں سے کامل طور پر مستفیض فرما کر متقین اور مقربین میں شامل فرمائے۔ آمین!

دعائے مغفرت

گوجرانوالہ سے بھائی حاجی محمد شبیر کے والد

گوجرانوالہ سے بھائی احمد رضا خان کی پھوپھو

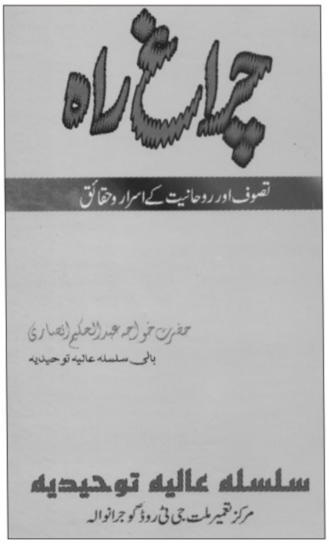
راولپنڈی سے بھائی غلام مرتضیٰ کی والدہ

لاہور سے بھائی خالد اسحاق (بابا جان کے بڑے داماد) کے بھائی

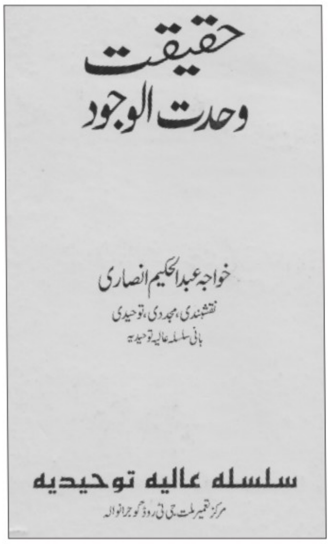
بقضائے الٰہی وفات پا گئے ہیں (اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـا اِلَیْهِ رَاجِعونَ)

مرحومین کی مغفرت اور بلندی درجات کیلئے دعا فرمائیں۔

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف

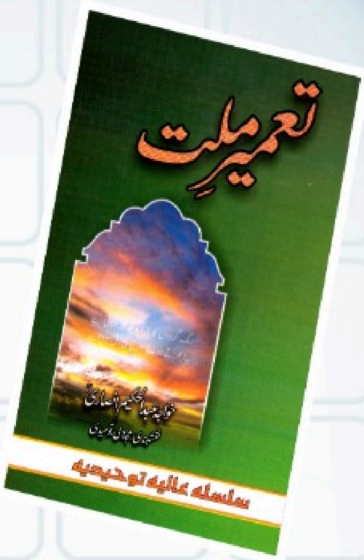


کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات،مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔زوال اُمت میں اُمراء ،علماء،صوفیاء کا کردار۔علماء اورصوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوّف کے انسانی زندگی پراثرات۔سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

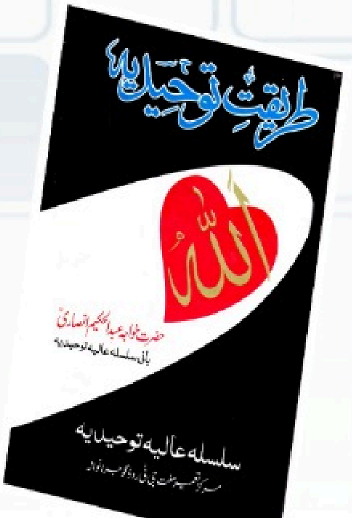


وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔مصنّفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدات کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کردیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقاء اور ترقی کیلئے دین کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریۂ وحدت الوجود کو جنم دیا اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظّام کو ہوجانے والی غلط فہمیاں۔

سلسلہ توحیدیہ کی مطبوعات



قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات، اسلامی تصوّف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار، ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کردیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد، اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کردیئے ہیں جس پر عمل کرکے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کرسکتا ہے۔